جلد-۱ شمارہ-۴
اکتوبر-نومبر ۲۰۲۵ء

بیادگار: مولانا محمد غزالی ندویؒ

امام بخاری ریسرچ اکیڈمی، علی گڑھ کا ترجمان

سہ ماہی

شہابِ ثاقب

علی گڑھ

مدیر
محمد فرید حبیب ندوی

اکیڈمی کی سرگرمیاں

اللہ کے فضل وکرم سے اکیڈمی مختلف قسم کی سرگرمیاں انجام دے رہی ہے، جن کی ہلکی سی جھلک مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ علمی، تحقیقی، دعوتی اور اصلاحی موضوعات پر تصنیف وتالیف۔

۲۔ مختصر ہفتہ واری 'الجمعہ' میگزین کی اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں اشاعت، جس کی سافٹ کاپی سوشل سائٹس پر اپلوڈ کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی اسے آڈیو کی شکل میں بھی نشر کیا جاتا ہے اور ای بک کی شکل میں یوٹیوب پر بھی اپلوڈ کیا جاتا ہے۔

۳۔ IMAM BUKHARI RESARCH ACADEMY کے نام سے یوٹیوب چینل ہے، جس پر مختلف علمی، فکری، دعوتی اور اصلاحی ویڈیوز اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

۴۔ آج کل کتابیں سننے کا ذوق عام ہو رہا ہے۔ اس لیے منتخب اور عمدہ کتابوں کو 'ای بک' کی شکل میں تیار کیا جاتا ہے۔

۵۔ اکیڈمی کے تحت کئی مکاتب چل رہے ہیں۔ ارادہ ہے کہ اس سلسلے کو اور بڑھایا جائے۔

۶۔ طلبہ وطالبات اور عام مسلمانوں کے لیے مختلف تربیتی اور اصلاحی کورسز کا انعقاد۔

۷۔ اکیڈمی جس ٹرسٹ کے ماتحت ہے، اس کے ذریعے خدمت خلق اور رفاہ عامہ کے مختلف کام انجام دیے جاتے ہیں۔

۸۔ اب ۲۰۲۵ء سے سہ ماہی علمی وتحقیقی مجلے کی اشاعت۔

آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اکیڈمی کی ترقی کے لیے دعا کریں اور اپنے مفید مشوروں سے نوازیں۔ جزاکم اللہ۔

★★★

امام بخاری ریسرچ اکیڈمی، علی گڑھ کا ترجمان

بیادگار: مولانا محمد غزالی ندویؒ

سہ ماہی

شہاب ثاقب

(اکتوبر-دسمبر ۲۰۲۵ / ربیع الآخر-جمادی الأخری ۱۴۴۷ھ)

جلد:۱ شمارہ:۴

مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

محمد خالد ضیا صدیقی ندوی

ابوطلحہ بنارسی ندوی مظاہری

عمر محمد غزالی

امام بخاری ریسرچ اکیڈمی، بندروالی گلی، ہاتھی ڈوبا، امیر نشان، علی گڑھ 202001

فہرست مضامین

افتتاحیہ

۱۔ حرفِ ناگزیر — **مدیر** — ۳

تنقید وتجزیہ

۲۔ دعوتِ تقریب بین الادیان؛ ایک تنقیدی جائزہ (۴) — **محمد فرید حبیب ندوی** — ۵

بحث وتحقیق

۲۔ کیا اتباع سنت کی احادیث میں تضاد ہے؟
(حدیث الثقلین کے تناظر میں شبہات کا جائزہ) — **محمد خالد ضیا صدیقی ندوی** — ۲۴

فکرونظر

۳۔ دورِ حاضر میں مسئلۂ تحفظ ختم نبوت
(کرنے کے کام، منصوبے اور طریقۂ عمل) — **محمد رضی الرحمان قاسمی** — ۴۳

محاکمہ وجائزہ

۴۔ حضرت ابوہریرہؓ پر اعتراضات-ایک علمی محاکمہ
(مصری مصنف ابوریہ کے دعووں کا جائزہ) — **محمد فرید حبیب ندوی** — ٦۷

نقد ونظر

۴۔ سیرت سے متعلق شبہات (۴) — **محمد فرید حبیب ندوی** — ۹۲

زرِ تعاون

فی شمارہ: /75

سالانہ: /300

خط وکتابت کا پتہ

عمر محمد غزالی، 4/332 بندروالی گلی، ہاتھی ڈوبا،
امیر نشان، علی گڑھ 202001
رابطہ نمبر: 9012621589 ,
ای میل: 12fareedamu@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

حرفِ ناگزیر

مدیر

قارئین محترم! تازہ شمارہ لے کر ایک بار پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔

یہ شمارہ پانچ مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلا مضمون دعوتِ تقریب بین الادیان کے تنقیدی جائزے پر مشتمل سیریز کی چوتھی قسط ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ یہود اور مسلمانوں کے نزدیک تقریب بین الادیان کی اس دعوت کی حقیقت کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کے افکار وخیالات، رجحانات ونظریات، ان کے فکروعمل کے تاریخی مراحل اور عملی کوششوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرا مضمون بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ منکرین حدیث، ذخیرۂ حدیث کو مشکوک بنانے کے لیے مختلف دلائل کا سہارا لیتے رہے ہیں۔ ان کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حدیثوں میں بڑا تضاد ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں نے عہدِ رسالت کے بعد اپنے اپنے موافق حدیثیں وضع کرلیں۔ اور چونکہ وہ الگ الگ نظریات وخیالات کے لوگ تھے، اس لیے ان کی گھڑی ہوئی حدیثوں میں تضاد در آیا۔ اگر وہ واقعۃً رسول اللہ ﷺ کی احادیث ہوتیں تو ان میں یہ تضاد موجود نہ ہوتا۔ اپنے اس دعوے کو مؤید کرنے کے لیے وہ بطور خاص ''حدیث الثقلین'' کو پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس حدیث کے طرق میں واضح تضاد ہے۔ کہیں تمسک بالسنۃ کی بات ہے تو کہیں تمسک بالعترۃ کی۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ شیعہ وسنی خیموں نے اپنے اپنے مقاصد کے لیے یہ حدیث وضع کی ہے۔

مضمون نگار مولانا محمد خالد ضیا صدیقی ندوی نے (جو ایک منجھے ہوئے قلم کار اور بہترین محقق ہیں) منکرین حدیث کے ان دلائل کا جائزہ لیا ہے، اور خاص اس حدیث کے تناظر میں ان کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کی قلعی کھولی ہے۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ یہ تضاد حقیقی نوعیت کا نہیں

ہے؛ بلکہ یہ سیاق وسباق اور پس منظر کا اختلاف ہے۔ پھر یہ کہ اگر اس طرح کا تضاد حدیث کو غیر معتبر بنانے کے لیے کافی ہے تو ایسا تضاد تو ہمیں قرآن کی آیات کے درمیان بھی نظر آتا ہے۔

تیسرا مضمون ختم نبوت سے متعلق ہے۔ ختم نبوت کا عقیدہ امت کا اجماعی عقیدہ رہا ہے، مگر ادھر کچھ عرصے سے اس پر شب خون مارنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عقیدہ دین کی اساس و بنیاد ہے۔ اسی طرح یہ امت کے اتحاد کو باقی رکھنے کا سب سے مضبوط ذریعہ ہے۔ اگر یہ عقیدہ سلامت نہ رہا تو امت کا اتحاد بھی باقی نہ رہے گا۔ عقیدۂ ختم نبوت کی اس اہمیت وحساسیت کے باوجود ہمارا عام طبقہ کبھی کبھی مدعیان نبوت اور ان کے پیروکاروں کی برپا کردہ گمراہیوں کا شکار ہو جاتا ہے اور ان کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنے 'انحرافات وضلالات' کی اشاعت کے لیے ہر جدید وقدیم ذرائع کا استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم اس عقیدے کے تحفظ کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی منصوبہ بند طریقے سے اس کے لیے ہر پلیٹ فارم پر کوششیں کرنی ہوں گی۔ مضمون نگار نے اس حوالے سے بڑے اہم خیالات کا اظہار کیا ہے اور کرنے کے کام اور طریقۂ کار پر بہترین روشنی ڈالی ہے۔

چوتھے مضمون میں مصری قلم کار جناب ابوریہ کے ان افکار وخیالات کا جائزہ لیا گیا ہے جو انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ کی شخصیت سے متعلق اپنی کتاب ''أضواء علی السنۃ المحمدیۃ'' میں پیش کیے ہیں۔ یہ علمی محاکمہ وجائزہ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعیؒ کی معروف کتاب ''السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی'' کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے

آخری مضمون شبہاتِ سیرت سے متعلق ہے۔ یہ ایک عظیم موسوعے کی تلخیص پر مشتمل سلسلہ وار مضامین کی چوتھی قسط ہے۔

اللہ تعالیٰ سے رسالے کی افادیت وقبولیت کی دعا کے ساتھ ساتھ، آپ حضرات سے علمی تعاون کی درخواست ہے۔

☆☆☆

تنقید وتجزیہ (قسط: ۴)

دعوتِ تقریب بین الادیان؛ ایک تنقیدی جائزہ

تحریر: ڈاکٹر احمد بن عبدالرحمان بن عثمان قاضی ترجمہ وتلخیص: محمد فرید حبیب ندوی

تیسری فصل

چوتھا مبحث

یہود کے یہاں تقریب بین الادیان کی حقیقت

تقریب کے بارے میں یہود کا موقف ان کے اس عقیدے سے جڑا ہوا ہے کہ وہ اللہ کی پسندیدہ قوم ہیں۔ قرآن نے بھی ان کی افضلیت کا ذکر کیا ہے، مگر اسے ایمان وعمل کی شرط کے ساتھ مقید کر دیا ہے۔ لہذا اب ان کے لیے کوئی فضیلت باقی نہیں رہی؛ کیوں کہ انھوں نے ایمان وعمل کی قید کو پورا نہیں کیا اور انبیا کی تکذیب کی اور انھیں قتل تک کیا۔

دوسروں کے بارے میں یہودی تحریکات کا موقف

ا۔ آرتھوڈوکس تحریک (روایت پسند)

عام یہودیوں کا اس بات پر اصرار ہے کہ وہ اللہ کی پسندیدہ قوم ہیں اور ان کی افضلیت ومحبوبیت غیر مشروط ہے۔ اگر وہ گناہ بھی کریں تب بھی وہ اللہ کے محبوب ہی رہیں گے۔ اس کے بالمقابل دوسروں کے تئیں وہ حقارت وکمتری کا نظریہ رکھتے ہیں۔ تلمود نے ان کے اس خیال کو پانی دینے کا کام کیا، چنانچہ اس کی عبارتیں دوسروں کے تئیں نفرت وحقارت سے بھری پڑی ہیں۔

ان تعلیمات کی وجہ سے یہود دوسروں سے کٹ کر اپنے بند معاشروں میں زندگی گزارتے رہے۔ اس کے نتیجے میں انھیں یورپی اور روسی معاشروں میں ذلت ومسکنت اٹھانی پڑی۔ خاص کر جب آخری دور کے نصاریٰ کو پتہ چلا کہ یہودی مذہبی کتابوں میں حضرت عیسیٰ اور ان کے متبعین کے بارے میں بہت زہر بھرا ہوا ہے، تو ان کے اندر یہود کی عداوت اور گہری ہوگئی۔

پہلے ہم عیسائیت اور اسلام کے بارے میں ان کے موقف کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں؛ تاکہ تقریب بین الادیان کے بارے میں ان کے موقف کو سمجھنا آسان ہوجائے۔

عیسائیت کے بارے میں ان کا موقف اس کے بارے میں صحیح واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے بغض وکراہت پر مبنی ہے، اور اس موقف کی دو بنیادیں ہیں:

۱۔ تلمود کی تعلیمات کی وجہ سے حضرت عیسیٰؑ کے خلاف کراہیت وافترا پردازی۔

۲۔ جہالت کی وجہ سے مسیحیت کو بت پرست مذہب سمجھا جاتا ہے، اور اس کی بنیاد ان کے عقیدۂ ثالوث اور عقیدۂ تجسد کی صحیح تفسیر سے عدم واقفیت ہے۔

اسلام کے بارے میں یہودیوں کا کیا موقف ہے، اس کی تفصیل شروع میں گزر چکی ہے۔ اگرچہ بعض چیزوں سے ایسا لگتا ہے کہ اسلام کے بارے میں ان کا موقف عیسائیت کی بنسبت کچھ نرم ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اسلام کے مقابلے میں عیسائیت سے زیادہ قربت رکھتے ہیں، جبھی تو انھوں نے عیسائیت سے دوستی کر رکھی ہے اور انھی کے تعاون سے اسرائیلی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

۲۔ یہودی اصلاحی تحریک

اخیر کی دو صدیوں میں یہودیوں کا ایک طبقہ عزلت پسندی اور سخت مذہبی پابندیوں سے آزاد ہوا، انھیں اصلاح پسند کہا جاتا ہے۔ اس میں 'تحریک ہسکلہ' (یہودی روشن خیالی کی تحریک) اور موسی مندلسن کا خاص ہاتھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی بار ۱۸۸۵ کے 'پٹسبرگ' (امریکہ) کے اصلاحی اجلاس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ کتاب مقدس خدا کی تصنیف وتالیف نہیں ہے؛ بلکہ وہ ایک انسانی کاوش ہے۔ اسی طرح اصلاح پسندوں نے یہودیت کی عقلی تفسیر کرنی شروع کی اور عہد قدیم کا از سر نو عملی بنیادوں پر مطالعہ کیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ یہودی مذہب میں بہت سی اخلاقی

قدریں ہیں جو دیگر مذاہب سے مشابہت رکھتی ہیں۔ اسی طرح انھوں نے تلمود کی بہت سی تحریمات (حرام کردہ چیزوں) کو منسوخ مان کر اس کے اخلاقی پہلو پر زور دیا۔ نیز انھوں نے یہودیوں کے ''منتخب قوم'' ہونے کے نظریے میں بھی ترمیم کی۔ اسی طرح انھوں نے نجات دہندہ مسیح کی شخصی واپسی کے تصور کو ایک انسانی اور اخلاقی مفہوم کے طور پر پیش کیا، یعنی انھوں نے مسیح کے شخصی طور پر دوبارہ آنے کے تصور کو قطعی طور پر مسترد کر دیا۔ اس کے بجائے انھوں نے ''مسیحی دور'' کا تصور پیش کیا، یعنی ایک ایسا دور آئے گا جو تمام بنی نوع انسان کے لیے امن، کمال اور اخلاقی بلندیوں کا دور ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خود کو ایک مذہبی گروہ مانتے ہیں نہ کہ نسلی قوم۔ اسی طرح یہ فلسطین کی طرف واپسی کے قائل نہیں اور نہ ریاست اسرائیل کا نظریہ رکھتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اصلاحی تحریک میں دو بنیادی باتیں پائی جاتی ہیں: ایک تو بعض عقائدی اصولوں اور نظریات سے آزادی۔ دوسری نجات دہندہ مسیح کی تاویل۔

۳۔ نسل پرست صہیونی تحریک

اوپر جس رجحان کا ذکر کیا گیا، اس کی آواز صہیونی تحریک کی آواز کے سامنے دب گئی۔ اس صہیونی تحریک نے سیاسی اور عوامی دونوں سطح پر اس کی زبردست کوشش کی کہ فلسطین کی سرزمین پر یہود کا قومی وطن قائم کیا جائے۔ اس تحریک کو ایک تو مذہبی بنیاد پرستی کی طرف سے مدد ملی۔ اس کے علاوہ دوسری مغربی سامراجی حکومتوں کی طرف سے بھی سپورٹ ملا۔

صہیونی تحریک نے ۱۹۴۸ میں اسرائیلی حکومت قائم کر کے اپنی اس جدوجہد کا ثمرہ حاصل کیا، اور اس حکومت کو خالص یہودی حکومت قرار دیا گیا، جس میں دوسروں کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ آٹھویں دہائی کے اوائل میں ایک یہودی اقلیت نے اس کے یہودی حکومت ہونے سے اختلاف کیا تو اس کے خلاف قانون بنا دیا گیا اور یہ کہہ دیا گیا کہ کسی کو بھی اس کی مخالفت کی اجازت نہیں۔

چونکہ ہم تقریب کے بارے میں یہود کے موقف کی بات کر رہے ہیں، اس لیے اس اعتبار سے مزید سنگین بات یہ ہے کہ انتہا پسند مذہبی یہودی تحریکوں کو پروان چڑھنے اور دوسروں کے تئیں تلمود میں بیان کیے گئے جذباتِ بغض وعداوت کا اظہار کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

۴۔ بنیاد پرست مذہبی تحریک

یہود کی بنیاد پرست تحریکوں میں ایک نمایاں تحریک غوش ایمونیم (Gush emunium) ہے۔(یہ نام عبرانی میں جماعتِ مومنین کے معنی رکھتا ہے)۔اگر چہ اسرائیلی معاشرے میں 'حریدی' جماعتیں بھی موجود ہیں،(حریدی کے معنی ہیں: خدا کا خوف رکھنے والا یعنی متقی)جو مذہبی رسوم ورواج کی پابند اور''ہالاخا''(یعنی مذہبی قانون) کی تعلیمات پر سختی سے عمل پیرا رہتی ہیں،اور جو سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیتیں اور نہ ان کی کوئی منصوبہ بند سیاسی تنظیم ہے؛ لیکن ایسی مذہب پرست جماعتوں میں اور بنیاد پرست مذہبی جماعتوں میں-جن میں سرفہرست غوش ایمونیم ہے- بڑا فرق ہے۔بنیاد پرست جماعتیں تمام مذہب پرستوں سے اس معنی میں الگ ہیں کہ یہ اپنے سیاسی پلان کی تکمیل کے لیے تورات اور تلمود کے عقائد کا سہارا لیتی ہیں۔اس کا نعرہ ہے:''سرزمین اسرائیل،اسرائیل کی قوم کے لیے،اسرائیل کی تورات کے مطابق''۔اس تحریک سے وابستہ خواتین ومرد حضرات نے یہ قسم کھا رکھی ہے کہ وہ فلسطین کی مغربی پٹی اور غزہ کے علاقے کو اسرائیلی حکومت میں شامل کر کے دم لیں گے اور اس کے لیے ضرورت پڑی تو اپنی جان بھی قربان کردیں گے۔

اس تحریک کی بنیاد کا سہرا شہر القدس کے ایک مذہبی مدرسے کو جاتا ہے،جس کا نام''مرکازِ ہراب''(ربی کا مرکز) ہے۔اس کا سربراہ ایک پرجوش صہیونی حاخام 'تسفی یہودا کوک'' تھا۔غوش ایمونیم تحریک کے لیڈران اسی مدرسے سے فارغ تھے۔حاخام 'کوک' کو اس تحریک کا لیڈر اور مرشد سمجھا جاتا ہے،اس نے اپنے پیروکاروں کے ذہن میں اسرائیل کے تئیں اندھا تعصب بھر دیا تھا۔ ۱۹۸۲ء میں اس کی وفات ہوئی۔

امریکی صاحب قلم 'ایان لاستک' نے حاخام 'تسفی یہودا کوک' اور اس کے دو شاگردوں حاخام 'مناحم کاشر' اور 'ہیرورلڈ فِش' کے افکار کا جائزہ لیا ہے۔ان کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ غوش ایمونیم اور اس کے کارندوں کے افکار وخیالات اس طرح کے ہیں:

۱۔ یہودی قوم سب سے اعلی اور اللہ کی جانب سے منتخب قوم ہے۔اس لیے وہ اخلاقی قانون کی پابندی سے مستثنی ہے۔اس کے برعکس صہیونی تحریک کا یہ نظریہ تھا کہ یہودی قوم بھی

دوسروں کے برابر ایک قوم ہے۔ یہودی بنیاد پرست فکر اسے قبول نہیں کرتی۔

۲۔ عرب-اسرائیل جنگ کی حقیقت:

غوش ایمونیم کے حاخام اپنے ہم وطن عربوں کو کنعانی یا اسماعیل کی اولاد کی نظر سے دیکھتے ہیں، اوران سے سامنے انھی شرائط کا اعادہ کرتے ہیں جو یوشع بن نون نے کنعانیوں کے سامنے ان پر حملہ کرنے سے پہلے پیش کی تھیں۔ انھیں تین آپشن دیے گئے تھے: فرار، یہودی حکومت کو تسلیم کرنا یا جنگ۔ اب بھی وہ یہی چاہتے ہیں کہ یہودی، عرب مسلمانوں کی طرف سے ان میں سے ہی کسی ایک بات کو قبول کریں، ان کے علاوہ کسی اورصورت سے وہ راضی نہ ہوں۔

۳۔ یہ لوگ مانتے ہیں کہ اسرائیلی حکومت کا دنیا سے الگ تھلگ ہونا اس بات کی 'لاہوتی علامت' ہے کہ مختار ومنتخب ہونا یہودی قوم کی خصوصیت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عہد قدیم سے معلوم ہوتا ہے کہ ''یہ وہ قوم ہے جو تنہا رہے گی''۔ یہ پیشن گوئی یہود کے دوسری اقوام سے ممتاز ہونے کو بتاتی ہے، اوراسرائیل کا الگ قیام گویا توراۃ کی اس پیشن گوئی کی تکمیل اوران کے منتخب ہونے کی دلیل ہے۔

۴۔ ان کے نقطۂ نظر میں گفتگو یا مذاکرات کے ذریعے حقیقی امن تک پہنچنا ناممکن ہے۔

۵۔ اس جماعت کے نزدیک سرزمین اسرائیل اساسی اہمیت کی حامل ہے، چنانچہ ان کا نعرہ ہے: ''اسرائیل کی زمین، قوم اسرائیل کے لیے، اسرائیل کی توراۃ کے مطابق''۔ یہ زمین مقدس ہے؛ اس لیے کہ اللہ تعالی نے اسے یہودی قوم کے لیے مقام منتخب کیا ہے۔

۶۔ موجودہ تاریخ کو تکمیلِ نجات کی نظر سے دیکھنا:

مثال کے طور پر ہٹلر کے ہاتھوں لاکھوں یہودیوں کے قتل (ہولوکاسٹ) کو یہ اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالی کی طرف سے ایک تادیبی کارروائی تھی؛ تاکہ اللہ کی پسندیدہ جماعت کو مجبوراً ارض میعاد کی طرف لوٹنا پڑے۔ اسی طرح دیگر واقعات کے سلسلے میں بھی ان کا یہی زاویۂ نگاہ ہے۔

۷۔ یہودیوں کا ایمان اور جذبۂ فنائیت: دوز بردست محرک:

باوجود اس کے کہ یہودی یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا اللہ سے ازلی وابدی عہد ہے، بنیاد پرست تصور انھیں یہ بھی باور کراتا ہے کہ یہ عہد ان کی کوششوں کے بغیر مکمل نہیں ہوگا؛ چنانچہ یہ لوگ یہودی

قوم میں اس کے لیے سب کچھ نچھاور کرنے کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

اس سے آپ نے دیکھا کہ یہودیوں کے یہ تصورات تقریب کے کسی بھی نظریے کو یکسر مسترد کردینے والے ہیں؛ اس لیے کہ ان کے اپنے خیال میں مطلق حق کے وہی مالک ہیں اور وہ اللہ کی پسندیدہ قوم ہیں۔ یہ ان سے اللہ کا ازلی وابدی عہد ہے، وہ اگرچہ نافرمانی کریں، تب بھی یہ عہد قائم ہے۔ پھر ان کا خیال ہے کہ مذاکرات سے مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔

اس سوچ کے ہوتے ہوئے اعتقادی مسائل میں یا مشترک قدروں کی تلاش میں کسی گفتگو کی گنجائش کیسے نکل سکتی ہے۔ اس کے برعکس وہ اس طرح کی کارروائیاں کرتے ہیں۔

۱۔ مغربی پٹی، غزہ اور جولان کی پہاڑیوں میں اپنی نوآبادیات قائم کرتے ہیں۔ نویں دہائی کے شروع تک ایسی نوآبادیات کی تعداد ۱۳۰/ سے تجاوز کرگئی تھی۔

۲۔ مسلم باشندوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے دہشت گردانہ کارروائیاں کرتے ہیں۔ نیز زبانی بھی اس قسم کے اعلانات کرتے رہتے ہیں۔

۳۔ مسجد اقصیٰ میں بم دھماکے کراتے رہتے ہیں۔

۵: تقریبی یہودی تحریک

دوسری جانب اگر ہم انھیں حوار وتقارب کے پلیٹ فارم پر تلاش کریں تو ایسے یہود بالکل نہیں ملتے جو حوار اور تقریب کی دعوت دیتے ہوں۔ بس ایک کتاب ملتی ہے، جسے نیویارک کی ’’UAHC (اتحاد الجمعیات الیہودیۃ) نے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا تھا، جو مختلف اصحاب قلم کی کاوش تھی، جس کا نام تھا: امریکہ میں مسلمانوں اور یہود کے درمیان حوار کی مشترکہ بنیادیں‘‘۔

اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں حوار کے بارے میں نظریاتی بنیادوں کا بیان ہے۔ اس میں کل سات مقالے ہیں، پانچ یہود کے، ایک مسلمان اور ایک عیسائی کا۔

دوسرے حصے میں عملِ حوار کی تنفیذ کے لیے آٹھ ایسے عملی پروگراموں کا ذکر ہے، جن میں دونوں مذاہب کے لوگ شریک ہوں۔

اس کتاب کا مقصد جیسا کہ مقدمے سے اندازہ ہوتا ہے یہود ومسلمانوں کے درمیان تعلقات کو بڑھانا اور دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنا ہے، اور جو عملی پروگرام ہوں گے ان کا مقصد

بھی یہ ہے کہ یہود اسلام کے بارے میں اور مسلمان یہودیت کے بارے میں واقفیت بہم پہنچا سکیں۔

پھر عملی پروگرام کا پہلا قدم یہ بیان کیا گیا ہے کہ دونوں اہل مذاہب کی ایک ٹیم جمع کی جائے جو حوار پر توجہ دے۔ پھر پروگرام کے عملی طریقوں کا ذکر ہے۔ ان میں یہ بھی شامل ہے کہ ''ابراہیم اور ان کی نسل'' کے عنوان سے ایک ویڈیو کیسٹ دکھانے کا نظم کیا جائے، جسے یہودی جانب سے تیار کیا گیا ہوگا۔

اس کتاب کے بموجب حوار میں ہمارے مخاطب اعلی اور مخصوص طبقات نہیں؛ بلکہ دونوں مذاہب کے مڈل کلاس طبقات ہیں کہ ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ہمارا مقصد مسلم و یہودی امریکی باشندوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنا ہے۔ ان عملی پروگراموں میں کچھ ایسی تصویریں بھی پیش کی گئیں جن سے دونوں کے درمیان مشابہت ومماثلت کے پہلو اجاگر ہوں۔

یہ تو وہ اہداف ہیں جن کو علانیہ ذکر کیا گیا ہے۔ ذیل میں ہم ان حقیقی اہداف کا بیان کرتے ہیں جو پس پردہ ہیں۔

۱۔ حاخام 'گری ایم. بریتون گرانٹ' کے مقالے کا عنوان ہے: ''الحاجۃ الی حوار بین المسلمین والیہود''۔ اس میں اس نے پہلے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں یہود کی ناواقفیت یا ناقص واقفیت کا اعتراف کیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ اس نقص کو ہم حوار اور تربیت کے ذریعے دور کر سکتے ہیں۔ اس نے دونوں مذاہب کے درمیان موجود تشابہ وتماثل کی مثالیں پیش کی ہیں، مگر پیش کش کا انداز ایسا ہے جس سے یہ ظاہر ہونے کے بجائے کہ دونوں کا مصدر ایک ہے، اس لیے یہ مماثلت ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مذاہب ایک دوسرے سے متاثر ہیں اور یہ کہ اسلام نے یہودیت کا اثر زیادہ قبول کیا ہے۔

اس کے افکار پر نظر ڈالنے سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

الف: اس کی زبان مصالحتی وانسانی ہے، جو پوری طرح اسرائیل کے سیاسی بنیاد پرستوں اور متعصب آرتھوڈوکس بنیاد پرستوں کی زبان سے جدا ہے۔

ب: اس نے حوار کی تیاری کے لیے وہی نہج پیش کیا ہے جو دوسری ویٹکن کے بعد نصاری کا رہا ہے، یعنی دوسروں سے واقفیت اور ماضی کے کینوں سے گلو خلاصی اور سلامتی کی تلاش۔

ج: حکومت اسرائیل کے قیام کا سیاسی خیال، منصوبۂ حوار پر غالب ہے، مگر اس نے بڑی چالاکی سے اس کو چھپایا ہے۔ چنانچہ اس نے تجویز دی ہے کہ ابھی ہم سیاسی مسائل سے علیحدہ رہیں گے۔ پھر جب حوار کے نتیجے میں ہم صحیح راہ پر چل پڑیں گے تو سیاسی مسائل کو بھی حوار میں شامل کریں گے۔

۲۔   حاخام ' آندریا ایل. ویلس' کے مقالے کا عنوان ہے: ''من المرض الی الحوار– مدخل الی الحوار بین الیھود والمسلمین''۔ اس نے سابق مقالہ نگار کے مقابلے میں زیادہ صراحت وحقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس نے سب سے پہلے اس راہ کی رکاوٹوں کا ذکر کیا ہے، جن میں یہ دو رکاوٹیں نمایاں ہیں:

ایک سیاست، جس کی وجہ سے یہودی مسلم تعلقات پر ایک غبار سا چھایا ہوا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ مشرق اوسط کے علاقائی مسائل اب عالمی بن گئے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مشرق وسطی سے دور رہنے والے یہودی اور مسلمان بھی جب آپس میں ملتے ہیں تو ان کے سروں پر بھی یہ سیاسی بادل موجود ہوتے ہیں۔ اس غبار کے ہوتے ہوئے مشرق وسطی میں ان دونوں کے درمیان حوار کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس لیے ہماری توجہ مشرق کی بجائے مغرب کی طرف ہونی چاہیے۔ وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ امریکہ کے مسلمانوں کو مشرق کے مسائل میں (جن میں سرفہرست اسرائیل وفلسطین کا قضیہ ہے) دلچسپی لینے کے بجائے اپنے مغرب کی طرف توجہ کرنی چاہیے، اور یہاں کے یہودیوں سے بہتر تعلقات قائم کرنے چاہیے، جس کا ایک اہم وسیلہ حوار ہے۔

دوسری رکاوٹ باہمی غلط فہمیاں ہیں۔ چنانچہ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ تمام مسلمان دہشت گرد یا بنیاد پرست ہوتے ہیں، جب کہ کچھ (مسلمان) یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں کسی تغیر وتبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔

پھر حاخام ' ویلس' نے حوار کے محرکات سے پردہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ اس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ میں مسلمانوں کی بڑھتی تعداد اور اسی طرح نومسلموں کی کثرت سے خوف کھا کر یہ یہودی اپنے غرور وتکبر سے نیچے اتر کر مسلمانوں سے حوار پر مجبور ہوئے ہیں۔

۳۔   یہی خطرہ تیسرے مقالہ نگار ' جوناتھن ڈی- سرنا' نے محسوس کیا۔ اس کے

مقالے کا عنوان تھا: ''الھویۃ الیھودیۃ فی العالم المتغیر للدیانۃ بأمریکا'' (امریکا میں بدلتی مذہبی صورت حال میں یہودی تشخص کا مسئلہ)۔اس نے امریکا کی مذہبی صورت حال کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۸۸۲ء تک یہ کہا جاتا تھا کہ امریکا ایک عیسائی ملک ہے۔ پھر یہود نے اس کی مخالفت کی اور اس تصور کی جگہ یہ تصور دیا کہ امریکا ایک یہودی ونصرانی وطن ہے۔ پھر یہ کہا جانے لگا کہ یہ ثلاثی المذہب وطن ہے، یعنی پروٹسٹنٹ، کیتھولک اور یہود کا وطن۔ یہود نے یہ فوائد اس کے باوجود حاصل کر لیے کہ امریکا کی اُس وقت کی کل آبادی ۱۶۰ر ملین میں ان کی تعداد محض ۵ر ملین تھی۔اب انھیں مستقبل کے حوالے سے خطرات محسوس ہو رہے ہیں۔ چنانچہ امریکا میں دیگر مذاہب، بالخصوص اسلام بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اکیسویں صدی میں یہ کہا جانے لگے کہ امریکی معاشرہ یہودی عیسائی اور مسلم معاشرہ ہے۔اس خطرے نے انھیں مجبور کیا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ حوار ومکالمہ منعقد کریں؛ تاکہ اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر بندھ باندھ سکیں۔

اس تناظر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہودی، مسلمانوں کے ساتھ حوار کے ذریعے چاہتے کیا ہیں؟

اس کتاب کے مقالہ نگاروں نے اس سوال کے دو طرح سے جوابات دیے ہیں:

ایک یہ کہ حوار سے مقصود امریکی اجتماعی زندگی میں تعاون کی صورتیں تلاش کرنا ہے۔

دوسرا مقصد: عقائد میں کسی موضوعی قربت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

دراصل یہودیوں کو عیسائی معاشروں کے بیچ زندگی گزارنے میں ہمیشہ بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ انھیں خطرہ رہا ہے کہ کہیں وہ اکثریتی معاشرے میں جذب نہ ہو جائیں۔ چنانچہ وہ حوار کو اپنے مذہبی تشخص کی حفاظت کا اہم ذریعہ سمجھتے ہیں۔جس طرح کے خطرات وہ محسوس کرتے ہیں، اسی طرح کے خطرات مسلمانوں کو بھی ہیں۔اس لیے وہ مسلمانوں کے ساتھ حوار وتقارب کرتے ہیں؛ تاکہ دونوں اپنے مذہبی تشخص کی حفاظت کرسکیں۔

ہماری رائے میں اس حد تک حوار میں کوئی حرج نہیں؛ لیکن بات جب اس سے آگے بڑھتی ہے تو خطرہ شروع ہو جاتا ہے۔

۴۔ ایک اور مقالہ نگار 'رؤون فائراسٹون' کے مقالے سے معلوم ہوتا ہے کہ دینی تراث پر مبنی مناظرہ و مباحثہ ہمیں کسی اتفاق تک نہیں پہنچا سکتا؛ بلکہ یہ کبھی بھی حوار اور تفاہم کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا۔ اس لیے قائدین مذہب پر ضروری ہے کہ اس سے آگے نکلیں اور خود کو بھی اور اپنے متبعین کو بھی اس خیال سے باہر نکالیں کہ تنہا وہی حقیقت مطلقہ کے وارث ہیں۔

اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہے کہ مسلمان اپنے دین پر کلی اطمینان سے محروم کر دیے جائیں۔ اور ایسا ہونا کچھ بعید نہیں جب ایک طرف اس طرح کے پر فریب نعرے دیے جائیں اور دوسری طرف ایسے عملی پروگرام کیے جائیں جن کی تخطیط و تنفیذ یہودی ذہن نے کی ہو۔

خلاصہ و تجزیہ

اس تفصیل سے پتہ چلا کہ حوار کے سلسلے میں یہود کے یہاں دو متضاد موقف پائے جاتے ہیں۔ ایک تردید کا، جو اصل موقف ہے، اور دوسرا قبول اور اس سلسلے میں پہل کرنے کا، جو بہت مغلوب موقف ہے۔

جو اصل موقف ہے، اس کے پیچھے وہی موروثی عقیدہ ہے کہ یہود سب سے افضل اور منتخب قوم ہیں۔ آرتھوڈوکس یہودیت کے دونوں طبقے (روایتی، جیسے حریدی گروہ، اور سیاسی بنیاد پرست، جیسے غوش ایمونیم اور کاخ پارٹی وغیرہ، جو اعتقادی طور پر تلمود کی تعلیمات کا سہارا لیتے ہیں، اور موجودہ سیاسی واقعات کی توجیہ عہد قدیم کی پیشن گوئیوں کی روشنی میں کرتے ہیں) سب اسی موقف کے نمائندے ہیں۔ فی الحال یہی موقف غالب و روز افزوں ہے، جیسا کہ اسرائیل کی سیاسی صورت حال گواہی دیتی ہے، اور لگتا ہے کہ یہ موقف بڑھتا ہی رہے گا، یہاں تک کہ وہ واقعہ پیش آ جائے جسے یہود و نصاری 'ہرمجدون' اور مسلمان 'ملحمۂ کبری' کا نام دیتے ہیں۔

دوسرا موقف شاذ موقف ہے، جس کو اصلاحی یہودی تحریک سے وابستہ رجحانات نے قبول کیا ہے، اور دراصل وہ اس کے ذریعے بعض علاقائی مفادات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

جس طرح پہلے موقف کے لیے یہ ممکن نہیں کہ نسلی بنیاد رکھنے کی وجہ سے اسرائیل سے باہر بار پا سکے، اسی طرح دوسرا موقف اسرائیل میں کمزور ہے اور اس کے لیے آسان نہیں کہ وہاں قوت و نفوذ حاصل کر سکے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اسرائیل کی اپنے پڑوسی ممالک کے

ساتھ تعلقات بہتر کرنے کی کوششیں صرف سیاسی محاذ پر منحصر نہیں؛ بلکہ اس نے ثقافتی اور اجتماعی سطح پر بھی تعلقات بہتر بنانے کی کوششیں کی ہیں، چنانچہ مذہبی پلیٹ فارم پر اس کی سب سے نمایاں مثال اشکینازی یہودیوں کے سب سے بڑے پادری 'اسرائیل لاؤ' کی شیخ الازہر سے ۱۵ دسمبر ۱۹۹۷ء کی ملاقات ہے۔ اس ملاقات سے متعلق کوئی مشترک بیان سامنے نہیں آیا۔ اسی طرح بی بی سی نے ۱۲ ر دسمبر ۱۹۹۸ء کو یہ خبر شائع کی ہے کہ یہودی پادری 'مناحم کرومان' نے ایران کا ویزہ حاصل کرلیا ہے، اور انھیں امید ہے کہ وہ ایران کی مذہبی وسیاسی لیڈرشپ سے ملاقات کریں گے اور کوشش کریں گے کہ ایران، اسرائیل کو کافر حکومت سمجھنے کے اپنے موقف کو تبدیل کرے۔

پھر ۱۹۹۸ء کے شروع میں یہود نے رباط میں منعقد حوار بین الادیان کی ایک کانفرنس میں شرکت کی۔ یہودی وفد کی قیادت اسرائیل میں سفاردی یہود کے سب سے بڑے پادری 'الیاہو باکشی' کر رہے تھے۔ شرق اوسط نامی اخبار نے ان کا ایک انٹرویو شائع کیا ہے، جس میں حوار کے ممکنہ نتائج سے متعلق ان سے سوالات کیے گئے تھے۔ ان کا جواب تھا:

۱۔ رباط کی یہ کانفرنس اپنی ذات میں ایک کمائی ہے۔

۲۔ بین مذاہب کشمکش جیسے غلط تصورات سے دور رہنا چاہیے۔ ان نزاعات کی بنیاد سیاسی ہوتی ہے۔ مذہب اور مذہبی لوگوں کو ان سے بچنا چاہیے؛ کیوں کہ مذہب تفاہم اور اتحاد کی بات کرتا ہے۔ میری رائے میں اس کانفرنس کا سب سے اہم پیغام صبر، تعایش اور سلامتی کی دعوت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سیاسی افراد بھی سلامتی کی زبان بولیں۔ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ سلامتی صرف حکومتوں کے درمیان نہ ہو؛ بلکہ قوموں کے درمیان ہو۔ سلامتی کو مضبوط کرنے میں مذہبی افراد اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔

یہود کی دھوکہ باز شخصیت کی طرف سے ایسی وقتی تصریحات پر کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ ان کے ارادے کیا ہیں۔ اسرائیل کا قیام ہی مذہبی بنیاد پر ہوا ہے۔ وہ آج بھی مسجد اقصی کو شہید کرنے کے تاریخی موقع کے انتظار میں ہیں۔ ان کی اس طرح کی تصریحات آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے ہیں، اور کچھ نہیں۔

پانچواں مبحث

تجدد پسند مسلمانوں کے نزدیک تقریب بین الادیان کی حقیقت

جدید دور میں مسلمانوں میں سے بھی علم کی طرف نسبت رکھنے والے بعض دانشوروں نے تقریب بین الادیان کا علم اٹھایا۔ ان لوگوں کو تجدد پسند کہا جاتا ہے۔ انھوں نے تجدید کے نام پر تحریف اور روشن خیالی کے نام پر مغرب زدگی کا جھنڈا بلند کیا۔ اس جماعت کے تلامذہ نے ان کے دور کو ''دورِ ترقی'' اور ان کے طریقے کو ''اصلاحی مکتب فکر'' کا نام دیا۔ ان لوگوں نے ماضی کی سلوٹوں میں گم فکر اعتزال کی یاد تازہ کر دی اور اسی کے دسترخوان سے خوشہ چینی کی۔

تجدد پسندوں پر معتزلہ کے اثرات کے نمایاں نقوش

(الف) عقل کی تقدیس میں غلو سے کام لینا اور عقل و نقل میں ظاہری تعارض کے وقت عقل کو نقل پر مطلق ترجیح دینا۔

اس اصول سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوئے۔

۱۔ غیبی امور اور معجزات کا انکار یا ان کی تاویل۔

۲۔ سائنس سے ٹکرانے والے نصوص کی تردید، جیسے اس حدیث کو رد کر دیا جس میں ذکر ہے کہ اگر کھانے میں مکھی گر جائے تو اسے پوری طرح ڈبو کر باہر پھینک دو۔

۳۔ قرآن کی بعض آیات کو حالیہ سائنسی انکشافات پر منطبق کرنا، حتی کہ ان چیزوں پر بھی جو ابھی صرف نظریات کے درجے میں ہیں۔

(ب) احادیث کے مقام و مرتبے کو گھٹانا۔ یا تو ان کی حجیت سے ہی انکار کر دینا، یا یہ کہنا کہ اعتقادی مسائل میں خبر واحد سے استدلال درست نہیں۔ نیز محدثین کے منہج، ان کی کوششوں اور ان کی کتابوں پر جو ہمیشہ امت میں مقبول رہی ہیں، طعن کرنا اور صحابہ و تابعین میں سے بعض ثقہ راویوں کی عدالت میں ردو قدح کرنا۔

(ج) ائمہ اعتزال اور فلاسفہ کی عظمت کے گن گانا، جب کہ ائمۂ حدیث کی شان گھٹانے کی کوشش کرنا۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ مستشرقین سے بھی بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں اور ان کے افکار کو جدید رنگ وآہنگ میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ جہاد کے ابطال کی دعوت۔

۲۔ مذہبی حکومت پر حملہ آوری اور اس کی جگہ سیکولر حکومت کی ثنا خوانی۔

۳۔ بعض شرعی حدود کے ثبوت میں شک پیدا کرنا جیسے ارتداد اور رجم کی سزا۔

۴۔ وطنیت و قومیت کے نام پر ذمیوں کے احکام کا ابطال کرنا۔

۵۔ عورت کی مغربی طرز کی آزادی کی دہائی دینا، نیز تعدد ازواج وغیرہ کو ختم کرنے اور میراث میں مساوات قائم کرنے کی دعوت۔

۶۔ سود کو مانوس بنانا اور حرام معاملات میں توسع اختیار کرنا۔

۷۔ اہل کتاب سے دوستی اور تقاربِ ادیان کی دعوت دینا۔

یہ ملحوظ رہے کہ اس مکتب فکر کے نمائندے اور ان سے متاثر ہونے والے افراد؛ سب فکری انحراف میں ایک ہی درجے پر نہیں ہیں؛ بلکہ ان میں درجہ بندی ہے۔ کچھ وہ ہیں جن سے بس ایک دو مسائل میں چوک ہوگئی ہے۔ چند ایسے ہیں جو پوری طرح مغربی عقل کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، جب کہ بعض بین بین ہیں۔

ذیل میں ہم ان تجدد پسندوں کے نزدیک حوار کی حقیقت پر تین نقاط میں بحث کریں گے:

۱۔ تقریب کی دعوت دینے کے لیے ان کا بعض اعتقادی شبہات پیدا کرنا۔

۲۔ اہل کتاب کے ساتھ معاملہ کرنے میں عملی تطبیقات۔

۳۔ ان کے نزدیک تقریب کا مفہوم اور اس کی منہجیت۔

۱۔ تقریب کی دعوت دینے کے لیے ان کا بعض اعتقادی شبہات پیدا کرنا

دعوتِ تقریب کے پیش نظر تجدد پسندوں کے لیے ضروری تھا کہ پہلے وہ کچھ اعتقادی مقدمات قائم کرلیں؛ کیوں کہ اس کے بغیر وہ اپنے اس بدعتی منصوبے کی تکمیل نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا انھوں نے چاہا کہ پہلے عقائد سے متعلق کچھ شبہات کھڑے کر دیں؛ تاکہ ان کی راہ آسان ہو جائے؛ لیکن ان کی یہ کوشش بارآور نہ ہوسکتی تھی؛ کیوں کہ اسلام کا عقیدہ ہر طرح سے محفوظ ہے۔ بہر

حال اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انھوں نے (معتزلہ کی نقالی کرتے ہوئے) قرآن کو مخلوق قرار دیا۔ اسے نقد کی کسوٹی پر جانچنے کی بات کہی۔ عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کی سنگینی کو ہلکا بنا کر پیش کیا۔ عیسائیوں کے جن کفریہ عقائد کا قرآن نے ذکر کیا ہے، انھوں نے موجودہ عیسائیوں پر ان کو منطبق کرنے سے انکار کیا اور قدیم عیسائیوں کے ساتھ مخصوص سمجھا۔ بہر حال اس طرح انھوں نے تاویل کے نام پر قرآنی نصوص میں تحریف کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے مختلف طریقے اختیار کیے جن میں چند یہ ہیں:

(الف) اسلام کے عام مفہوم میں موجودہ اہل کتاب کے شامل ہونے کا مغالطہ دینا

یہ بات ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن میں جن اہل کتاب کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے، ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو بعثت محمدﷺ سے پہلے اپنے اپنے ادوار میں اپنی کتابوں کی تعلیم پر قائم تھے۔ ان سے موجودہ وہ اہل کتاب مراد نہیں جنھوں نے حضور اکرمﷺ کا زمانہ پایا اور پھر بھی آپ پر ایمان نہ لائے؛ لیکن ان تجدد پسندوں نے موجودہ اہل کتاب کو بھی مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ایسے لوگوں میں محمود ابوریہ، محمد سعید عشماوی، عبداللطیف غزالی، محمد عمارہ، فہمی ہویدی، محمد طالبی اور سعد غراب جیسے لوگ شامل ہیں۔

محمد عمارہ کہتے ہیں:

''ثواب حاصل کرنے اور اللہ کے عذاب سے بچنے کا جو وعدہ اللہ تعالی نے کیا ہے، وہ صرف شریعت محمدی پر ایمان لانے والے مؤمنین سے نہیں ہے؛ بلکہ یہ وعدہ ان سب سے ہے جو اللہ کے دین کو اختیار کرنے والے ہیں، یعنی وہ لوگ جو اللہ پر اور جزا وحساب پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے لیے نیک کام کرتے ہیں، ان سب سے نجات وسعادت کا یہ وعدہ ہے......خواہ وہ شریعت محمدی پر ایمان رکھنے والے ہوں، یا شریعت موسی پر یا شریعت عیسی پر، یا چاہے وہ صابی ہی ہوں''۔

(ب) رسالت محمدی پر ایمان کی حیثیت گھٹانا

جب ان تجدد پسندوں نے اہل کتاب؛ بلکہ دیگر ملتوں کو بھی اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کی، تو اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ان کے نزدیک محمد رسول اللہﷺ پر ایمان لانے کی کوئی خاص اہمیت نہ رہے۔ چنانچہ یہی ہوا اور انھوں نے مؤمن ہونے اور آخرت میں نجات پانے کے لیے

رسالت محمدی پر ایمان لانے کو ضروری نہ سمجھا۔

محمد عمارہ کہتے ہیں:

''اگر سابقہ شریعتوں کے پیروکار اپنے رسولوں کی تو تصدیق کرتے ہوں؛ لیکن محمد ﷺ کی رسالت ونبوت کی تصدیق نہ کرتے ہوں-البتہ توحید واطاعت پر قائم ہوں-تو محمد ﷺ کی رسالت کو تسلیم نہ کرنا، انھیں دینِ اسلام کے دائرے سے خارج نہیں کر دیتا۔ان کا یہ موقف انحراف کہلائے گا۔محمد ﷺ پر ایمان رکھنے والے اور آپ کی نبوت کا انکار کرنے والے کے درمیان بس وہی فرق ہے جو بدعت سے پاک مومن اور بدعتی مومن کے درمیان ہوتا ہے''۔

(ج) دین وایمان کے الفاظ سے کھلواڑ

ان لوگوں نے کفر وایمان اور کافر ومشرک کے الفاظ سے کھلواڑ کرنے کی کوشش کی اور ان کا بالکل نیا اور انوکھا مفہوم بیان کیا۔محمد عمارہ کہتے ہیں:

''جو شخص متبعین محمد (ﷺ) کی طرح ہر اس چیز پر ایمان لاتا ہے جو اللہ نے نازل کی، قرآن ہو یا اس سے پہلے کی کتابیں، اور جب سے رسالت کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اس وقت سے لے کر تمام رسولوں پر ایمان لاتا ہے تو وہ ہدایت یافتہ ہے۔اور جو شخص ان میں سے کسی چیز کا انکار کرتا ہے؛ البتہ وہ توحید اور اطاعت کو نہیں چھوڑتا تو وہ گمراہی میں ہے اور اس چیز کا کافر (بمعنی منکر) ہے جس پر ایمان نہیں لایا؛ لیکن وہ مشرک نہیں ہے؛ اس لیے کہ وہ دین دار اور موحد ہے؛ بلکہ وہ مسلمان ہے''۔

غور کیجیے کہ موصوف نے کس طرح کافر اور مشرک کے درمیان فرق کیا ہے اور کفر کو ایک نسبتی چیز قرار دے کر کسی خاص چیز کے منکر (کافر) کو مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

(د) جھوٹی تاویلوں کا سہارا لے کر اہل کتاب کے کفر کی طرف سے معذرت کرنا

اللہ تعالی نے قرآن کریم میں مختلف جگہ اہل کتاب کے کافر ہونے کی صراحت کی ہے اور ان کے کفر کے اسباب بھی شمار کرائے ہیں، مثلاً یہ کہ وہ طرح طرح کے شرک میں مبتلا ہیں، اور خاص کر عیسائی تثلیث، ابنیت مسیح اور الوہیت مسیح کے عقیدے کو مانتے ہیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ لوگ محمد ﷺ کو اللہ تعالی کا آخری رسول نہیں مانتے اور آپ کے اتباع کو ضروری نہیں سمجھتے۔

شروع سے اب تک تمام علمائے اسلام اہل کتاب کو کافر ہی سمجھتے رہے ہیں، مگر آخری دور میں ہمارے بعض نام نہاد مسلمان، اہل کتاب کے کفر کی تاویلیں کر کے انھیں مسلمان ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔

ان کی جھوٹی تاویلیں اس طرح کی ہیں کہ قرآن نے جن چیزوں کی وجہ سے اہل کتاب پر کفر کا حکم لگایا ہے، اہل کتاب کے نزدیک ان کا وہ مفہوم مراد ہی نہیں ہے جو قرآن کے پیش نظر ہے، یا یہ کہ قرآن نے جن عقائد کو اہل کتاب کی طرف منسوب کیا، وہ قدیم اہل کتاب ہیں۔ موجودہ اہل کتاب پر یہ چیزیں منطبق نہیں ہوتیں۔

۲۔ تجدد پسندوں کے نزدیک اہل کتاب کے ساتھ معاملہ کرنے کی عملی شکلیں

تجدد پسند مسلمانوں نے تحریف وتاویل کے ساتھ اہل کتاب؛ بالخصوص عیسائیوں کے ساتھ معاملہ کرنے کی نئی نئی شکلیں نکالیں اور اپنے خیالات کو عملی تطبیق دینے کی کوشش کی اور اس کے لیے انھوں نے بعض اعتقادی اور شرعی اصول وقواعد کی بیخ کنی سے بھی پرہیز نہیں کیا۔ اور یہ سب کچھ انھوں نے اصلاح وتجدید اور اجتہاد وروشن خیالی کے نام سے کیا۔ اس طرح کی چیزوں میں تین نمایاں ہیں:

(الف) اہل کتاب سے موالات ودوستی

شیخ محمد عبدہ نے تو اس حد تک غلو کیا کہ اپنی کتاب ''الاسلام والنصرانیۃ مع العلم والمدنیۃ'' کی ساتویں فصل کا نام ہی یہ رکھ دیا ''عقیدے کے اعتبار سے جو لوگ ہمارے مخالف ہیں ان سے مودت ودوستی کا بیان''۔ جب کہ قرآن نے بڑی صراحت کے ساتھ اہل کتاب اور دیگر تمام کفار سے مودت وموالات کی ممانعت کی ہے۔

(ب) ذمیوں کے احکام سے براءت کا اظہار اور ان پر معذرت کرنا

تجدد پسندوں نے جزیہ اور ذمیوں سے متعلق احکام میں بھی تبدیلی کی کوشش کی۔ انھوں نے اہل کتاب سے جزیہ ساقط ہونے کی بات کہی، اور یہ تاویل کی کہ جن اہل کتاب پر جزیہ لاگو کرنے کی بات کہی گئی ہے، وہ ایک خاص گروہ تھا۔ جنس اہل کتاب پر جزیہ لاگو نہیں کیا جائے گا، اور یہاں تک کہا کہ ذمیوں اور جزیہ سے متعلق احکام فقہا کی اختراع ہیں۔

سبحان اللہ! کیا انھیں معلوم نہیں کہ صحابۂ کرام اور تابعین عظام جب جہاد میں جاتے تو اہل کتاب کے سامنے یہ تین آپشن رکھتے: اسلام، یا جزیہ یا تلوار۔

(ج) ''وطنیت اور مذہبی آزادی'' کے نعرے لگانا اور مسلمانوں کے امتیاز کا انکار کرنا

ان لوگوں نے کھل کر مسلم اور غیر مسلم کی مساوات اور برابری کا اعلان کیا اور اہل ایمان کے امتیاز اور ان کی افضلیت کا سرے سے انکار کر دیا۔

فہمی ہویدی نے کہا کہ: ''یہ بات صحیح نہیں کہ اس دنیا میں مسلمان کوئی ممتاز گروہ ہیں اور محض مسلمان ہونے کی وجہ سے دوسرے انسانوں سے فائق ہیں''۔

کیا ایمان صحیح اور پاکیزہ عقیدہ ممتاز ہونے کے لیے کافی نہیں؟ اگر ہے تو پھر مسلمانوں کے امتیاز کا انکار کیوں کر؟

مسلمانوں کے امتیاز کو تسلیم کرنے کے بجائے انھوں نے مذہبی آزادی کا نعرہ دیا اور اس کا مطلب بعض نے یہ بیان کیا کہ اسلام کی نظر میں ہر ایک کو اپنی مرضی کا دین قبول کرنے اور اپنا مذہب تبدیل کرنے کی اجازت ہے؛ حالانکہ اسلام ایسی آزادی کا بالکل قائل نہیں؛ بلکہ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مذہب حق صرف اسلام ہے؛ البتہ دنیا میں کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا؛ لیکن اگر کسی نے اسلام قبول کر لیا تو پھر اس کے لیے اسے چھوڑنے کی گنجائش نہیں ہوگی۔

۳۔ تجدد پسندوں کے نزدیک تقریب کا مفہوم اور اس کی منہجیت

یہ لوگ قرآنی اصطلاح ''جدال احسن'' کی جگہ تقریب اور حوار جیسی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں؛ بلکہ انھوں نے صرف شرعی اصطلاح ہی کو ترک نہیں کیا، حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے شرعی منہج کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ ذیل میں ہم ان کے نزدیک تقریب کے تصور اور اس کی منہجیت کو، ان کے اس مسئلے سے متعلق طرز عمل کے ذریعے واضح کریں گے:

الف: حوار کی تعریف وتمجید میں غلو

یہ لوگ حوار کی ایسی عظمت بیان کرتے ہیں کہ قاری سوچنے لگتا ہے کہ امت اپنی طویل تاریخ میں اس قابل تعریف چیز سے دور کیوں رہی؟ یوسف حسن کہتے ہیں کہ ''حوار انسان کی زندگی کا جوہر ہے اور شریعت کے اہم مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد ہے''۔

ب: باہمی تعارف کی اہمیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا

حوار کے عیسائی فریق کی طرف سے باہمی مفاہمت اور ایک دوسرے کے مذہبی تجربات سے فائدہ اٹھانے پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ بعض تجدد پسندوں نے بھی اس کی بڑی اہمیت بیان کی ہے۔

حالانکہ قرآن وسنت نے مسلمانوں کو اہل کتاب کا سچا تعارف پہلے ہی عطا کر دیا ہے۔ پھر یہ نئی سچی واقفیت کیا چیز ہے! ان کی کوشش یہی ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو یہ باور کرا دیں کہ ان سے متعلق قرآن وسنت کی بنائی ہوئی تصویر درست نہیں ہے۔ اس لیے از سر نو ان کی صورت سازی ضروری ہے۔

ج: کلمۂ سواء کی دعوت کو اعتقادی مفہوم سے ہٹا کر دوسرے مضامین سے جوڑنا

قرآن میں جو کلمۂ سواء کی دعوت دی گئی ہے، اس کا مقصود یہ ہے کہ اہل کتاب اپنے خود ساختہ مذاہب وعقائد سے دست بردار ہو کر توحید کی طرف آئیں اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا چھوڑ دیں؛ مگر تجدد پسند حضرات اسے اس مفہوم سے ہٹا کر مشترکہ قدروں پر محمول کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس میں اہل کتاب کو توحید کی دعوت نہیں دی گئی ہے؛ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ ان چیزوں کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہیں۔ مثلاً انسانیت کے فائدے کے کام اور دنیا کو غلامی سے نجات دلانا وغیرہ۔ وہ اس لفظ کو دینی عقائد سے ہٹا کر دنیوی اور معاشی وسماجی مسائل پر منطبق کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے انسانیت کی بھلائی کا کام کریں۔

اس طرح یہ لوگ اس آیت میں تحریف معنوی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک کلمۂ سواء سے مراد معاشی ضرورتیں، سماجی مسائل اور اخلاقی قدریں ہیں، نہ کہ توحید اور ترکِ شرک۔

د: اسلام کی دعوت موقوف کرنے کی دعوت

یہ لوگ دعوت الی اللہ کی اہمیت کو بالکل ختم کر دیتے ہیں؛ بلکہ اس کی ضرورت کا ہی انکار کر دیتے ہیں۔ یوسف حسن کا کہنا ہے کہ ”حوار کے دیگر مشترکہ فوائد ہیں۔ اس میں تبشیر یا دعوت کا دخل نہیں ہوسکتا“۔

محمد طالبی نے دعوت موقوف کرنے کے لیے یہ دلائل پیش کیے ہیں:

۱۔ دعوت موجودہ دور میں نہیں چل سکتی۔

۲۔ ہدایت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔(پھر دعوت کا کیا فائدہ؟)

۳۔ دعوت دینا ایک دوسرے کے احترام کے منافی ہے۔

بھلا بتائیے پھر انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت کس مقصد سے ہوئی تھی؟ اور اس امت کو خیر امت کیوں کہا گیا؟

ہ: مغربی ثقافت کو قبول کرنے اور اس کے رنگ میں رنگ جانے کی دعوت

تجدد پسندوں میں سے ایک لبرل گروہ مغربی تہذیب کا بڑا دلدادہ ہے اور کہتا ہے کہ مسلمانوں کے مسائل کا حل بس یہی ہے کہ وہ مغربی تہذیب و ثقافت اور اس کے علمی و فکری نتائج کو قبول کر لیں۔ اسی ضمن میں انھوں نے ''اسلامی بنیاد پرستی'' کی اصطلاح ایجاد کی اور پھر اس کی مذمت و تنقیص کی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تجدد پسند مسلم مفکرین نے کس طرح حوار و تقریب کے نام پر تحریف کی ہے، اور کس طرح انھوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ اللہ تعالی ہم سب کو دین کی صحیح سمجھ نصیب فرمائے۔ آمین۔

بحث وتحقیق

کیا اتباع سنت کی احادیث میں تضاد ہے؟
(حدیث الثقلین کے تناظر میں شبہات کا جائزہ)

محمد خالد ضیا صدیقی ندوی
(مدرسہ معینیہ عظمت العلوم، صاحب گنج، مظفر پور)

احادیث سے اشتغال رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ ذخیرۂ حدیث میں بہت سی احادیث ایسی پائی جاتی ہیں جن میں الفاظ کا اختلاف ہوتا ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں، جن کو محدثین نے تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ مگر حدیثوں کے مابین الفاظ کے اس اختلاف کو تضاد قرار دے کر منکرین حدیث نے حدیث سے اعتماد اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اسی طرح کا خیال وہ ان احادیث کے بارے میں ظاہر کرتے ہیں جن میں کتاب اللہ کے ساتھ ''سنتی'' یا ''عترتی'' کا لفظ آیا ہے۔ یہ حدیث، حدیث الثقلین کے نام سے معروف ہے۔ معترضین کہتے ہیں کہ اس حدیث کے بعض طرق میں صرف سنت نبوی کی پیروی کا حکم ملتا ہے۔ جیسے: ''إني قد خلفت فيكم شيئين،لن تضلوا بعدهما أبداً، كتاب الله و سنتي،ولن يتفرقاحتى يردا على الحوض''، جب کہ بعض دوسری احادیث میں سنت نبوی کے ساتھ خلفائے راشدین کی بھی سنتوں کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسے: ''عليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين المهديين''۔ اس کے علاوہ بعض احادیث ایسی بھی ملتی ہیں جن میں نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کی سنتوں کی پیروی کے بجائے اہل بیت کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسے: ''إني تركت فيكم ما إن أخذتم به ،لن تضلوا :كتاب الله ،وعترتي أهل بيتي''۔ یہ تضاد اور اختلاف

روایات اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ احکامات نبی ﷺ نے نہیں دیے؛ بلکہ یہ سارے تصورات مسلمانوں میں گردش زمانہ سے پیدا ہوئے۔

ڈاکٹر راشد شاز لکھتے ہیں:

''بعض احادیث میں اگر تمسک سنت رسول اللہ کا بیان ہے، تو بعض احادیث اس بیان کو ''سنة الخلفاء الراشدين المهديين'' تک وسیع کر دیتی ہیں، جس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ سنت کا یہ تصور خالصتاً تاریخ کی پیداوار ہے''۔(۱)

آگے مزید لکھتے ہیں:

''اس قسم کی باتیں جو تاریخ کو دین کے مستند ماخذ کے طور پر پیش کرتی ہوں، یا اس کی تقدیس کی داعی ہوں، دراصل اس عہد کی پیداوار ہیں جب مسلمانوں کے مختلف سیاسی گروہوں نے اپنے موقف کی حمایت میں تقدیسی تاریخ کے استعمال کو اپنے اوپر مباح کر لیا تھا۔ ہمارے اس خیال کی تائید اس قسم کے منسوب الی الرسول اقوال سے ہوتی ہے، جن میں حضرت علیؓ کی مدح یا مناقب عثمانؓ و معاویہؓ میں غلو کی حد تک روایتیں پائی جاتی ہیں۔ خود یہ روایت کہ :''خلفت فيكم شيئين'' اہل تشیع کے یہاں بالکل ہی مختلف انداز سے بیان ہوئی ہے۔ شیعہ محدثین کے نزدیک ''شيئين '' میں کتاب اللہ کے علاوہ دوسری چیز سنت رسول نہیں؛ بلکہ اس سے مراد ''عترة أهل بيتي'' ہے۔ سنت بنام ''عترة أهل بيتي'' ان دو فرقوں کے مابین اتنا بڑا اور بنیادی اختلاف ہے جس نے دین کے دو مختلف اور جداگانہ تصور کو جنم دیا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اہل سنت کی بیان کردہ روایت صحیح ہے یا اہل تشیع کا فہم دین زیادہ مستند، ان احادیث کے بیان سے دین کی مفروضہ دو بنیادوں میں سے ایک پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے''۔(۲)

ازالہ

اس حدیث کا تفصیلی جائزہ ہم آگے پیش کریں گے؛ لیکن اس سے پہلے مختصراً یہ عرض کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ دونوں طرق میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ دراصل دونوں باتیں الگ الگ پس منظر و سیاق میں کہی گئی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ متکلم ایک ہی موضوع پر دو الگ الگ موقعوں پر الگ الگ زاویے سے بات کرتا ہے، اور سننے والے اسے اسی طرح نقل کرتے ہیں جس

طرح انھوں نے سنا ہوتا ہے، بعد میں جس شخص تک یہ دونوں باتیں پہنچتی ہیں اور وہ یہ نہیں جانتا کہ یہ دونوں باتیں الگ الگ موقعوں پر الگ الگ زاویے سے کہی گئی ہیں، وہ انھیں تضاد بیانی پر محمول کر لیتا ہے؛ لیکن اگر آدمی سمجھ دار ہے، تو وہ اسے تضاد بیانی پر محمول کرنے کی بجائے دونوں باتوں کا الگ الگ محمل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور حتی الامکان انھیں متضاد نہیں مانتا، الا یہ کہ جمع و تطبیق کی کوئی صورت نہ رہے۔ اس کی مثالیں ہمیں قرآن مجید میں بھی ملتی ہیں۔

یہی صورت حال یہاں ہے۔ جہاں کتاب اللہ کے ساتھ سنت نبوی کی اتباع کا حکم ہے، وہاں شریعت کا بنیادی اصول ذکر کیا گیا ہے کہ کتاب اللہ اور سنت نبوی دونوں کی اتباع کو لازم پکڑا جائے۔ اور جہاں کتاب اللہ کے ساتھ عترتی کا ذکر ہے، وہاں سنت نبوی کا ذکر کرنے کی بجائے اس کے حصول کے ایک مستند ذریعے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ سنت کا نام لینے کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں کی گئی کہ جب کتاب اللہ کی پیروی کرنے کے لیے کہا گیا، تو اس میں سنت کی پیروی کا لزوم خود آ گیا؛ اس لیے کہ قرآن مجید نبی ﷺ کی اتباع کا حکم دیتا ہے۔ مثلاً ان آیات: ﴿وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾، ﴿وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾، ﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي﴾ سے نبی ﷺ کی سنت یعنی آپ کے طریقے کی پیروی کا وجوب واضح طور پر ثابت ہے، اس لیے زیر بحث حدیث میں سنت کا ذکر کرنے کی بجائے لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بعد آپ کی سنتیں، آپ کے طریقے، آپ کے ارشادات اور احکامات کیسے اخذ کیے جائیں؟ آپ ﷺ نے اس حدیث میں اسی کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ میں اپنے اہل بیت یعنی اپنی ازواج مطہرات، اپنی بیٹیاں، اپنے نواسے، اپنے چچا عباس اور ان کے بیٹے عبد اللہ بن عباس اور اپنے چچا زاد بھائی حضرت علی وغیرہ کو چھوڑے جا رہا ہوں، جنھوں نے میرے شب و روز کو دیکھا ہے۔ جو خلوتوں اور جلوتوں میں ساتھ رہے ہیں۔ وہ تمھیں میری زندگی کی ایک ایک بات بتا دیں گے۔ ضروری نہیں ہے کہ ان میں سے ہر ایک زندگی کے ہر گوشے کے سلسلے میں تمھاری رہنمائی کر دے؛ لیکن ان میں سے کسی نہ کسی سے تمھیں اپنے معاملے میں دینی رہنمائی مل ہی جائے گی۔ جو بات تمھیں صفیہؓ کے پاس نہیں ملے گی، میمونہؓ کے پاس مل جائے گی۔ جو میمونہؓ کے پاس نہیں ہوگی، وہ ام سلمہؓ کے پاس مل جائے گی۔ جو ام

سلمہ سے نہیں ملے گی، وہ حفصہؓ سے ملے گی۔ جو حفصہ کے پاس نہیں ہوگی، وہ عائشہؓ یا بنات طاہرات میں سے کسی کے پاس ہوگی، یا علی یا ابن عباس کے پاس ہوگی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ سب میرے طریقے پر قائم ہیں، اور میرے کارخانے میں ڈھلے ہوئے سکے ہیں۔ ان میں سے جس کی زندگی کے مطابق اپنی زندگی بنالوگے، تمھاری زندگی درست ہوجائے گی۔

یا یوں کہہ لیں کہ یہ اختلاف دراصل اجمال وتفصیل کی وجہ سے محسوس ہو رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ کسی موضوع سے متعلق بات کرتے وقت کبھی تو بات کرنے والا اختصار سے کام لیتا ہے اور صرف بے حد ضروری باتیں پیش کرتا ہے اور بعض ضروری باتوں کو چھوڑ دیتا ہے، جب کہ اسی موضوع پر بات کرتے ہوئے کبھی وہ تمام ضروری باتیں؛ بلکہ بعض ذیلی نقاط بھی پیش کرتا ہے۔ کم فہم اسی کو تضاد سمجھ لیتے ہیں، جب کہ اس طرح کے اجمال وتفصیل میں نہ تو کوئی تضاد ہوتا ہے، اور نہ ہی یہ کسی نظریے کے ارتقائی مراحل سے گزرنے یا تاریخ کے پیداوار ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو ان احادیث میں تضاد نظر آرہا ہے، وہ اگر قرآنی نصوص کو ایک دوسرے سے کاٹ کر دیکھیں، تو انھیں وہاں اس سے زیادہ واضح تضاد نظر آئے گا۔ قرآن مجید میں ہمیں ایسی بے شمار آیتیں ملتی ہیں جن میں کبھی تو کسی موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے، اور کبھی اس موضوع کے صرف ایک پہلو کو بیان کر کے دوسرے پہلوؤں سے صرف نظر کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت:۶۲ ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُواْ وَالَّذِينَ هَادُواْ وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحاً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ اور سورہ نساء کی آیت:۱۳۶ ﴿وَمَن يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلاَئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلاَلاً بَعِيداً﴾ مثال میں پیش کی جاسکتی ہے۔ اول الذکر آیت میں اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہونے کی صورت میں جنت کی بشارت دی گئی ہے، جب کہ ثانی الذکر آیت میں اللہ اور یوم آخرت پر ایمان کے علاوہ فرشتوں، آسمانی کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانا لازم قرار دیا گیا ہے اور ان کے انکار کو سخت گمراہی قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن کی وہ آیات بھی ہیں جن میں سے بعض میں صرف اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، جب کہ بعض میں اللہ اور رسول کے ساتھ اولی الامر کی بھی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اب کیا اس طرح کے اجمال وتفصیل کی وجہ سے یہ اور

ان جیسی دوسری آیات کو متضاد یا تاریخ کی پیداوار قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! اسی طرح مذکورہ احادیث میں بھی کوئی تضاد نہیں ہے۔ تضاد نظر آنے کی وجہ یہ ہے کہ ان احادیث کو ایک دوسرے سے کاٹ کر دیکھا جا رہا ہے۔ اگر ان کو ایک دوسرے سے جوڑ کر دیکھا جائے، تو تضاد کی بجائے یہ سب احادیث ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہوئی نظر آئیں گی؛ اس لیے کہ جو چیز ایک جگہ ذکر نہیں کی گئی، وہ دوسری جگہ ذکر کر دی گئی۔

مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

''...مثال کے طور پر قرآن میں کہیں تو صرف ایمان باللہ پر زور دیا گیا ہے (التغابن:۹/ البقرۃ:۲۵۶) کہیں خدا کے ساتھ یوم آخر کا ذکر ہے (البقرۃ:۸،۶۲) کہیں خدا کے ساتھ رسولوں پر ایمان لانے کا حکم ہے (آل عمران:۱۷۹) کہیں خدا کے ساتھ محمد ﷺ پر ایمان لانے کی تعلیم ہے (الأعراف:۱۵۸/ النور:۶۲/ الفتح ۱۳) کہیں یوم آخر اور کتب الٰہی پر اعتقاد رکھنے کی شدید تاکید ہے (البقرۃ:۴) کہیں ایمان کے پانچ اجزا بیان کیے گئے ہیں: یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسل، ایمان بالکتب، ایمان بالملائکۃ اور ایمان بالیوم الآخر (النساء:۱۳۶)۔ ان مختلف مقامات میں درحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے؛ بلکہ ایک مقام پر ایمانیات کو یکجا بیان کر کے دوسرے مقامات پر اُن میں سے ایک ایک، دو دو کو حسب موقع وضرورت زیادہ زور دے کر پیش کیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس اصل سے قطع نظر کر کے اور کسی ایک آیت کو لے کر یہ دعوی کر دے کہ مومن ہونے کے لیے صرف خدا کی توحید پر، یا محض خدا اور یوم آخر پر، یا فقط خدا اور رسولوں پر ایمان لانا کافی ہے، اور یہ گمان کر لے کہ اجزائے ایمانی میں سے بعض کا انکار کر کے بھی بعض کا اقرار انسان کے لیے نافع ہو سکتا ہے، تو دراصل یہ قرآن کی زبان اور اُس کے انداز بیان سے قطعی ناواقفیت کا نتیجہ ہوگا''۔(۳)

یا یوں کہہ لیں کہ کہیں بات اصالۃً ہے اور کہیں تبعاً۔ اس کی وجہ سے اندازِ گفتگو اور الفاظ میں فرق در آیا۔ کم فہموں نے اسی کو تضاد سمجھ لیا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ اصل مطلوب صرف اللہ کے احکام اور نبی ﷺ کی سنت کی اتباع ہے، جس کا ہمیں قرآن وحدیث دونوں میں حکم دیا گیا ہے۔ ﴿وَأَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا

الرَّسُولَ﴾ اور﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي﴾ جیسی آیات اور''إني قد خلفت فيكم شيئين،لن تضلوا بعدهما أبداً: كتاب اللّٰه و سنتي'' جیسی احادیث میں اسی بات کا اعلان ہے۔اور جن روایات میں خلفائے راشدین کی اتباع کا حکم ہے،تو ان کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرح ان کے اقوال و افعال کو بھی تشریعی حیثیت دی جا رہی ہو؛ بلکہ ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ قرآن وحدیث کے نصوص کو سمجھنے،شریعت کے مزاج سے واقف ہونے، اسی طرح اختلاف کی صورت میں راہ حق کو جاننے اور نبی کریم ﷺ کے بعد پیش آنے والے نئے مسائل کے سلسلے میں شریعت کا منشا معلوم کرنے کے لیے ان حضرات کی مدد لی جائے۔ نبی کریم ﷺ کی مستقل صحبت اور شب و روز آپ کو مختلف مسائل میں فیصلہ کرتے ہوئے دیکھ کر خلفائے راشدین کو مزاج نبوت و شریعت سے جو آگاہی تھی،وہ دوسرے لوگوں اور خاص طور پر بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے کیوں کر ممکن تھی،اس لیے نبی کریم ﷺ کے بعد پیش آنے والے نئے حالات اور مسائل میں ان حضرات کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ ان کی اتباع کا حکم مستقلاً نہیں ہے؛ بلکہ کتاب وسنت کی اتباع کے تابع ہے۔اگر ان حضرات کا طریقہ کتاب وسنت کے حکم اور ان کے منشا کے مطابق ہوگا،تو ان کی اتباع کی جائے گی ورنہ نہیں۔ ''عليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين المهديين'' میں''الراشدين المهديين'' کا لفظ اسی بات پر دلالت کرنے کے لیے آیا ہے کہ ان ہی کی اتباع کرنی ہے جو کتاب وسنت کی اتباع کر کے خود راہ راست پر ہوں،اور اسی وقت اتباع کرنی ہے جب ان کی بات کتاب وسنت سے نہ ٹکرائے۔ بالفاظ دیگر ان حضرات کی کوئی بات اگر کتاب وسنت اور شریعت کے اصولوں سے ٹکرائے گی،تو وہ قبول نہیں کی جائے گی۔ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان کی اتباع در حقیقت کتاب وسنت ہی کی اتباع ہے۔

جن احادیث میں اہل بیت کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے،ان کا مطلب بھی اہل بیت کے اقوال و اعمال کو تشریعی حیثیت دینا نہیں ہے؛ بلکہ ان کا مقصد امت کو کچھ ایسی آئیڈیل شخصیات فراہم کرنا ہے جن سے وہ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کو عملی طور پر سیکھ سکے۔اہل بیت یعنی نبی ﷺ کی ازواج مطہرات،آپ کی بیٹیاں،آپ کے نواسے،آپ کے چچا عباسؓ اور ان کے بیٹے

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، اسی طرح آپ کے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ وغیرہ فرق مراتب کے ساتھ کتاب وسنت سے جس درجہ آگاہ تھے، کم لوگ تھے۔ صرف ازواج مطہرات سے کتب حدیث میں ہزاروں احادیث مروی ہیں، جن سے مسلمانوں کی خانگی اور معاشرتی زندگی کے سیکڑوں مسائل ماخوذ ہیں۔(۴)۔

اس وافر علم کے ساتھ خانوادۂ نبوت میں وقت گزارنے کی وجہ سے یہ لوگ مزاج شریعت سے بھی آگاہ تھے، اور شرعی معاملات میں ان سے غلطی کا امکان بہت کم تھا، اس لیے ان کی اتباع کرنے کا حکم دیا گیا، جس کا بے غبار مطلب تھا کہ دینی مسائل میں ان کی طرف رجوع کیا جائے۔ ان سے کتاب وسنت کا علم حاصل کیا جائے اور شریعت کے احکام سیکھے جائیں؛ لیکن اگر ان حضرات سے کوئی چیز خلاف شریعت صادر ہوجائے، تو اس کی اتباع جائز نہ تھی۔ نہ ہی ان حضرات کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ کتاب وسنت سے بے نیاز ہوکر کوئی بات اپنی طرف سے کہہ دیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ان کی اتباع کتاب وسنت ہی کی اتباع تھی۔

خلاصہ یہ کہ خلفائے راشدین کی اتباع کا حکم ہو یا عترت رسول کی، دونوں کا حکم تبعاً تھا نہ کہ اصالۃً، جب کہ سنت نبوی کی اتباع کا حکم اصالۃً ہے، اس لیے خلفائے راشدین یا عترت رسول کی اتباع کے سلسلے میں آنے والی حدیثوں کا ان احادیث سے کوئی تعارض نہیں ہے، جن میں سنت نبوی کی پیروی کا حکم ہے۔

شاز صاحب نے سنت رسول کو صرف اس لیے تاریخ کی پیداوار قرار دے ڈالا کہ انھوں نے پہلے سے اپنا ایک نقطۂ نظر بنالیا تھا۔ پھر جب انھوں نے احادیث پر نظر ڈالی تو وہ اپنے اسی نقطۂ نظر کے زیر اثر تھے۔ مولانا مودودیؒ نے کتنی پیاری بات لکھی ہے:

''انسان کی رائے کا تمام تر انحصار اس کے نقطۂ نظر پر ہے۔ جب کسی مسئلے پر وہ مخالف نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے، تو اس کو تمام مخالف ہی مخالف دلائل ملتے چلے جاتے ہیں۔ اور جب موافق نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے، تو موافق اور مخالف دونوں قسم کے دلائل پر اس کی نظر پڑتی ہے اور دونوں میں موازنہ کرکے وہ ایک معتدل رائے قائم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اعدائے اسلام کے حملوں سے متاثر ہوکر یا غیر محتاط علما کی روایات سے دل برداشتہ ہوکر احادیث سے بدظن ہو چکے

ہیں، وہ جب مخالفانہ ذہنیت کے ساتھ احادیث پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو حدیثوں کے ناقابل احتجاج ہونے کے لیے دلائل ملتے چلے جاتے ہیں''۔(۵)

خلاصہ یہ کہ یہ اختلاف وتضاد اس لیے محسوس ہو رہا ہے کہ دونوں باتیں الگ الگ سیاق وپس منظر میں کہی گئی ہیں۔ یا یوں کہہ لیں کہ ایک جگہ اجمالاً بات کہی گئی ہے جب کہ دوسری جگہ تفصیلاً۔ یا یوں سمجھ لیں کہ ایک جگہ اتباع کا حکم اصالتً ہے، جب کہ دوسری جگہ تبعاً۔ ان تینوں پہلوؤں سے جو اختلاف نظر آتا ہے، اسے تضاد نہیں کہا جاتا۔ یہ چیز تو ہمیں قرآن میں بھی نظر آتی ہے۔

ان تمام پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہوئے اگر آپ اس حدیث کا مطالعہ کریں گے، تو سرے سے کوئی اشکال ہی نہیں ہوگا۔ اور اسے شیعہ اور سنی کو دو خیموں میں بانٹنے کا ذمہ دار بھی نہیں ٹھہرایا جاسکے گا۔ اگر کوئی شخص اپنے خودساختہ اعتقادات ونظریات اور اغراض ومفادات کی بنا پر فرقوں میں تقسیم ہوجائے، تو قرآن یا حدیث کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانا، ایک غیر ذمہ دارانہ عمل ہے۔ لوگوں کے اپنے پیدا کردہ اختلافات کی بنیاد پر حدیث کو اگر مطعون کیا جانے لگے، تو بات حدیث ہی تک نہیں رہے گی؛ بلکہ قرآن کی بھی بہت سی آیات پر سوالیہ نشان لگ جائے گا۔ سچی اور پکی بات وہی ہے جو مولانا مودودیؒ کے قلم سے نکلی ہے کہ''

مسلمانوں کی تباہی کا اصل سبب روایات نہیں ہیں؛ بلکہ نفسانیت اور عصبیت جاہلیہ اور فروع کو اصول سے بڑھ کر اہمیت دینے کی حماقت اور کتاب اللہ وسنت رسول ﷺ کو چھوڑ کر اپنے مزعومات میں حد سے زیادہ غلو کرنے کی عادت اور نئے نئے طریقے ایجاد کرنے کا شوق ہے۔ اگر یہ نہ ہو، تو روایات کے اختلاف سے کوئی فتنہ پیدا نہیں ہوسکتا''۔(۶)

ایک اور زاویے سے

اس گفتگو کے بعد حدیث الثقلین پر ایک اور زاویے سے نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس حدیث کے مختلف طرق میں الفاظ کے اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے۔ بہت سے طرق میں ''كتاب الله'' کے ساتھ دوسری چیز ''عترتي أهل بيتي'' آئی ہے، جب کہ بہت سے طرق ایسے ہیں جن میں ''كتاب الله'' کے ساتھ دوسری چیز ''سنة رسول الله'' آئی ہے۔ الفاظ کے اسی فرق کی بنا پر شاذ صاحب کے بقول امت مسلمہ دو فرقوں میں بٹ گئی۔

ہم اس حدیث میں دو پہلوؤں سے غور کریں گے:

۱۔ حدیث کے الفاظ اوران کی تخریج کے لحاظ سے۔

۲۔ حدیث کے معنی ومفہوم کے لحاظ سے۔

پہلی بحث: حدیث کے الفاظ اوران کی تخریج

(الف) جن راویوں نے سنت کی بجائے ''عترت'' کا لفظ نقل کیا ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) حضرت علی بن ابی طالبؓ (۷)

(۲) حضرت ابوسعید خدریؓ (۸)

(۳) حضرت جابر بن عبداللہؓ (۹)

(۴) حضرت جبیر بن مطعمؓ (۱۰)

(۵) حضرت حذیفہ بن اسیدؓ (۱۱)

(۶) حضرت زید بن ارقمؓ (۱۲)

(۷) حضرت زید بن ثابتؓ (۱۳)

(۸) حضرت عبداللہ بن حنطبؓ (۱۴)

(۹) حضرت نبیط بن شریطؓ (۱۵)

مذکورہ بالا راویوں نے جو روایتیں نقل کی ہیں، ان میں صرف لفظ ''عترت'' وارد ہوا ہے۔ان میں ''عترت'' کی اتباع یا اس کو مضبوطی سے تھامے رہنے کا حکم نہیں ہے۔اختصار کے پیش نظر ساری روایتوں کو نقل نہیں کیا جارہا ہے؛ البتہ ان کے الفاظ یوں آئے ہیں:" واللّٰہ سائلکم عن اثنتين: عن القرآن وعن عترتي"۔

اسی طرح صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقمؓ کی روایت میں اللہ کے نبی ﷺ نے کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامے رہنے کا حکم دیا ہے اوراس کی ترغیب دی ہے۔پھر صحابۂ کرامؓ کو اہل بیت کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھنے کی تلقین اور نصیحت فرمائی ہے۔اس میں کہیں بھی ان کی اتباع کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کو یہ حدیث سنائی تھی، حدیث کے

الفاظ یہ ہیں:

"أيها الناس! فإنما أنا بشر، يوشك أن يأتي رسول ربي فأجيب، وأنا تارك فيكم ثقلين :أولهما : كتاب الله، فيه الهدى والنور، فخذوا بكتاب الله، واستمسكوا به"، فحث على كتاب الله ورغب فيه، ثم قال :" وأهلُ بيتي"۔ أذكركم الله في أهل بيتي۔أذكركم الله في أهل بيتي۔ أذكركم الله في أهل بيتي"۔(۱۶)

"اے لوگو! میں بھی ایک انسان ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ میرے رب کا فرستادہ (ملک الموت) میرے پاس آجائے تو میں اس کی دعوت قبول کرلوں۔ میں تمھارے درمیان دو بھاری (عظیم المرتبت) چیزیں چھوڑے جارہا ہوں: ان میں سے پہلی کتاب اللہ ہے، جس میں ہدایت اور روشنی کا کافی سامان ہے، لہذا کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ اس پر عمل پیرا رہو۔ (راوی کہتے ہیں کہ آپ نے کتاب اللہ (پر عمل پیرا ہوانے) پر خوب ابھارا، اور لوگوں کو اس کی ترغیب دی، پھر فرمایا:) اور میرے اہل بیت۔ اور میں تمھیں اپنے اہل بیت کے سلسلے میں اللہ کو یاد دلاتا ہوں۔ میں تمھیں اپنے اہل بیت کے سلسلے میں اللہ کو یاد دلاتا ہوں۔ میں تمھیں اپنے اہل بیت کے سلسلے میں اللہ کو یاد دلاتا ہوں"۔

امام قرطبیؒ لکھتے ہیں:

"اللہ کے رسول ﷺ کا تین مرتبہ یہ فرمانا: "أذكركم الله في أهل بيتي" اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اہل بیت اور آپ ﷺ کے آل کا احترام واکرام، ان کی توقیر وتعظیم، اور ان کے ساتھ محبت اور حسن سلوک کا معاملہ کرنا اسی طرح واجب ہے جس طرح فرائض ادا کرنا، جن کو ترک کرنے کا کسی کے لیے عذر نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان اہل بیت کو یک گونہ اللہ کے نبی ﷺ سے خاص تعلق بھی ہے؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ آپ ﷺ ہی کا ایک حصہ ہیں تو بے جا نہ ہوگا؛ کیوں کہ یہی لوگ آپ ﷺ کے اصول ہیں جن سے آپ نکلے، اور آپ ﷺ کے فروع ہیں جو آپ سے نکلے"۔(۱۷)

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

"اہل بیت کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کے ساتھ خیر خواہی کا رویہ اختیار کرنے،

اوران کے احترام واکرام کرنے کے سلسلے میں کوئی دورائے نہیں۔اس کا کوئی منکر نہیں ہے۔اور کوئی ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ جب کہ وہ روئے زمین کے سب سے پاکیزہ اور شریف گھرانے اور پاک نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کی عزت واحترام کا معاملہ تو اس وقت اور دو چند ہو جاتا ہے جب وہ سنت نبویہ کے متبع بھی ہوں، جیسا کہ ان کے اسلاف میں حضرت عباس اوران کی اولاد، حضرت علیؓ، ان کے گھر والے اوران کی ذریت؛ یہ سب کے سب سنت نبویہ پر عامل تھے‘‘۔(۱۸)

علامہ ابن بازؒ لکھتے ہیں:

’’ہم ان اہل بیت سے (جو شریعت خداوندی کے پابند ہوں) محبت کرنے والے، ان کی خوشنودی حاصل کرنے اوران کو بندگان خدا سے بہتر تسلیم کرنے میں تمھارے (اہل تشیع کے) ساتھ ہیں؛ کیوں کہ ہم اس وصیت اورتاکیدی حکم پر عمل کرتے ہیں جو اللہ کے رسول ﷺ نے کہا تھا‘‘۔(۱۹)

ایک دوسری جگہ ’’أذكركم الله في اهل بيتي‘‘ کی مراد کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’اہل بیت میں آپ ﷺ کی ازواج مطہرات اور بنو ہاشم سے تعلق رکھنے والے آپ ﷺ کے قرابت دار شامل ہیں۔اور آپ ﷺ نے اس جملے کے ذریعے لوگوں کو اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ وہ اہل بیت کے ساتھ نرمی کا معاملہ کریں۔ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں۔ان سے تکلیفوں کو دور کریں۔انھیں حق کی تلقین کریں اور جب تک وہ آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین پر مضبوطی سے جمے رہیں اور آپ ﷺ کی شریعت پر عمل پیرا رہیں، ان کے حقوق ادا کرتے رہیں‘‘۔(۲۰)

خلاصہ یہ کہ بعض طرق میں اہل بیت کی اتباع کا حکم نہیں ہے۔ہاں آپ ﷺ کی وفات کے بعد ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی وصیت اور تاکید ہے اور بس! البتہ بعض روایتیں ایسی بھی ہیں جن میں ’’عترت‘‘ کا لفظ بھی آیا ہے، اور اس کے تھامے رہنے کا حکم بھی آیا ہے۔ایسی روایتیں مندرجہ ذیل صحابہ سے منقول ہیں:

(۱) حضرت علی بن ابی طالبؓ

”تركت فيكم ما إن أخذتم به لن تضلوا: كتابَ الله ، سببه بيده و سببه بأيديكم،و أهلَ بيتي“. (۲۱)

(۲) حضرت زید بن ثابتؓ

''إنـي تـارك فيـكـم مـا إن تـمسـكتم به لن تضلوا: كتابَ اللّٰه،وعترتي أهل بيتي،فإنهما لن يتفرقا حتى يردا عليّ الحوضَ''.(۲۲)

(۳) حضرت زید بن ارقمؓ

''إنـي تـارك فيـكم ما إن تمسكتم به لن تضلوا بعدي- أحد هما أعظم من الآخـر -: كتـاب اللّٰـه،حبـل ممـدود مـن السـمـاء إلـى الأرض ، وعترتي أهـل بيتـي،ولـن يتـفـرقـا حتـى يردا علي الحوض ،فانظروا كيف تخلفوني فيهما''۔(۲۳)

(۴) حضرت جابر بن عبداللہؓ

'' يـا أيهـا الـنـاس ! إنـي تركت فيكم ما إن أخذتم به لن تضلوا: كتاب اللّٰه ،وعترتي أهل بيتي''.(۲۴)

(۵) حضرت ابوسعید خدریؓ

''إنـي قـد تركت فيكم ما إن أخذتم به لن تضلوا بعدي: الثقلين- أحد هما أكبر من الآخر - كتاب اللّٰه،حبل ممدود من السماء إلى الأرض ، وعترتي أهل بيتي، ألا وإنهما لن يتفرقا حتى يردا علي الحوض ''.(۲۵)

(ب) جن راویوں نے ''عترت'' کی بجائے ''سنت'' کا لفظ نقل کیا ہے، وہ درج ذیل ہیں:

(۱) حضرت عمر بن الخطابؓ (۲۶)

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرؓ (۲۷)

(۳) حضرت عبداللہ بن عباسؓ (۲۸)

(۴) حضرت انس بن مالک (۲۹)

(۵) حضرت ابوہریرہؓ (۳۰)

(۶) حضرت ابوسعید خدریؓ (۳۱)

(۷) حضرت عروہ بن زبیرؓ (۳۲)

(۹) حضرت عبداللہ بن اَبی نجیحؒ (۳۳)

(۱۰) حضرت عمرو بن عوف المزنیؓ (۳۴)

(۱۱) حضرت موسیٰ بن عقبہؒ (۳۵)

(۱۲) حضرت ناجیہ بن جندبؓ (۳۶)

(۱۳) امام مالک بن انسؒ (۳۷)

خلاصہ یہ کہ ''حدیث الثقلین'' کبھی ''کتاب اللہ وعترتی ''اور کبھی ''کتاب اللہ وسنتی'' کے الفاظ سے آئی ہے۔اور اول تو دونوں طرح کی روایتوں کو نقل کرنے والے راویوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔اس لیے دونوں میں سے کسی کو موضوع نہیں کہا جا سکتا۔ثانیاً دونوں طرح کی روایتوں میں اگر کچھ سندیں ضعیف اور کمزور ہیں،تو کچھ سندیں بہت عمدہ ہیں،اس لیے دونوں سے استدلال کرنا بالکل درست ہے۔

دوسری بحث: حدیث کا معنی ومفہوم

اس حدیث کو ''حدیث الثقلین'' کہا جاتا ہے ؛ کیوں کہ بعض روایتوں میں اللہ کے رسول ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے: ''إني تارك فيكم الثقلين'' (میں تمھارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں)

الثَقَل (بفتح التاء والقاف) اس سامان کو کہتے ہیں جو جانوروں کے اوپر لدا ہوا ہو۔(۳۸)

(الف) کتاب وسنت/کتاب وعترت کو ''ثقلین'' کہنے کی وجہ

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو ''ثقلین'' ان کے عظیم المرتبت ورفیع المنزلت ہونے اور ان کی بلندی شان کی بنا پر کہا گیا ہے۔امام نوویؒ فرماتے ہیں: ''سُمِّيا ثقلين، لعظمهما وكبير شأنهما ''. (۳۹)

(ب) حدیث کے معنی ومفہوم میں علما کے اقوال

(۱) ابن قدامہ مقدسیؒ کہتے ہیں:

ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ''ثقلین سے مراد ''قرآن'' اور ''عترت'' ہے؛ بلکہ اس سے مراد

’’قرآن اور سنت‘‘ ہی ہے؛ کیوں کہ امام مالکؒ نے اپنی کتاب مؤطا میں جو روایت نقل فرمائی ہے اس میں ’’عترت‘‘ کی بجائے ’’سنت رسول‘‘ کا تذکرہ ہے۔ پوری روایت یوں ہے: "تركت فيكم أمرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما: كتاب الله و سنة رسوله" اور جہاں آپ ﷺ نے ’’عترت‘‘ کا لفظ ارشاد فرمایا ہے، اس کی وجہ بس یہی ہے کہ آپ کی عترت (اہل خاندان) آپ کے حالات سے زیادہ باخبر ہیں۔(۴۰) اس لیے سنت کے حوالے سے ان کی بات زیادہ وزنی ہوگی۔

(۲) امام آمدیؒ کہتے ہیں:

’’ثقلین‘‘ سے ’’کتاب وعترت‘‘ مراد ہونا ہمیں تسلیم نہیں؛ کیوں کہ ایک روایت میں آپ ﷺ کے الفاظ یہ آئے ہیں: كتاب الله و سنتي"۔ (۴۱) یعنی ثقلین کی مراد خود اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن وسنت سے متعین فرمادی ہے۔

(۳) شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

’’اللہ کے نبی ﷺ نے اپنی ’’عترت‘‘ کے بارے میں فرمایا ہے کہ میری عترت اور قرآن مجید کبھی الگ نہیں ہو سکتے، یہاں تک کہ وہ دونوں میرے پاس حوض پر حاضر ہو جائیں۔ ظاہر سی بات ہے آپ تو صادق ومصدوق ہیں، اس لیے آپ کی اس بات میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟! پتہ چلا کہ عترت کا اجماع حجت ہے۔ ہمارے اصحاب کی ایک جماعت کا یہی کہنا ہے۔ قاضی نے بھی ’’معتمد‘‘ کے اندر اسی خیال کا اظہار فرمایا ہے؛ لیکن یہ واضح رہے کہ عترت سے مراد سارے بنی ہاشم ہیں (یعنی عباس کی اولاد، علی کی اولاد، حارث بن عبد المطلب کی اولاد، اور ابو طالب کے سارے بیٹے اور دیگر حضرات بھی)۔ ’’عترت‘‘ میں صرف حضرت ’’علی‘‘ ہی داخل نہیں ہیں۔ اور سردار عترت خود آپ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ (یہ سب جانتے ہیں کہ) کتاب وسنت اور اجماع کی روشنی میں امت کا اجماع حجت اور معتبر مانا جاتا ہے۔ اور عترت بھی امت کا ایک حصہ ہیں، لہذا امت کے اجماع کے ثبوت سے عترت کا اجماع بھی لازم آتا ہے‘‘۔ (۴۲)

(۴) ابن حجر ہیثمیؒ فرماتے ہیں:

’’ایک صحیح روایت میں ہے: إني تارك فيكم أمرين، لن تضلوا إن

اتبعتموهما، وهما: كتاب الله وأهل بيتي عترتي" اور ایک روایت میں ہے "کتاب اللہ وسنتي، اور یہی (سنت) مراد ہے ان احادیث سے جن میں صرف ''کتاب'' کا ذکر آیا ہے (یعنی نہ عترت کا آیا ہے اور نہ سنت کا)؛ کیوں کہ سنت ہی قرآن کو کھول کھول کر بیان کرنے والی ہے، لہذا کتاب کے تذکرے کے بعد ''سنت کے تذکرے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ (تمام روایتوں کو سامنے رکھ کر جو) نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ کتاب اللہ اور سنت رسول کو مضبوطی سے تھامے رہنے کے ساتھ ساتھ اہل بیت کے ان علما کو بھی مضبوطی سے تھامے رہنے کی ترغیب ہے، جو کتاب وسنت میں درک اور بصیرت رکھتے ہوں''۔ (۴۳)

(۵) ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

''گھر والے عام طور پر گھر کے افراد کے احوال سے زیادہ باخبر ہوتے ہیں، اس لیے حدیث میں عترت سے مراد اہل بیت کے وہ علما ہیں، جو آپ ﷺ کی سیرت اور طرز عمل سے زیادہ واقف، اور آپ ﷺ کے حکم وحکمت کے ادا شناس ہوں، اس لیے ان کو ''کتاب اللہ'' کے بالمقابل'' رکھنا بالکل درست ہے۔ خود اللہ کا ارشاد ہے: ويعلمهم الكتاب والحكمة". (۴۴)

(۶) شیخ البانیؒ فرماتے ہیں:

''سب جانتے ہیں کہ یہ حدیث اہل تشیع کا مستدل ہے۔ یہ ہمیشہ ان کی زبان زد رہتی ہے، حتی کہ بعض اہل سنت بھی اس باب میں ان کو حق بجانب سمجھتے ہیں؛ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس حوالے سے دونوں گروہ وہم کا شکار ہیں۔ اس حدیث میں دو پہلو سے غور کرنے کی ضرورت ہے:

پہلی بات تو یہ یاد رکھنے کی ہے کہ ''عترت'' کے مفہوم میں اہل تشیع کی مراد سے زیادہ وسعت ہے۔ اور اہل سنت بھی اسے تسلیم کرتے ہیں۔ وضاحت اس کی یہ ہے کہ حدیث میں جو ''لفظ عترت'' آیا ہے اس سے مراد ''اہل بیت'' ہیں جیسا کہ بعض طرق میں واضح طور پر یہ الفاظ موجود ہیں: "وعترتي أهل بيتي"۔ اور حقیقت میں اہل بیت آپ کی ازواج مطہرات ہیں جن میں عائشہ صدیقہؓ بھی شامل ہیں۔ اہل تشیع کا آیت قرآنی (اشارہ ہے سورہ احزاب کی اس آیت کی طرف: "إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا" [الأحزاب: ۳۳]) میں اہل بیت کو حضرت علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ اور حسینؓ کے ساتھ خاص کرنا

اور ازواج مطہرات کو شامل نہ کرنا دراصل اپنی خواہشات کی تائید کے لیے قرآن کی آیت میں تحریف ہے۔

دوسری بات یہ کہ اہل بیت سے مراد ان کے وہ نیک علما ہیں جو کتاب وسنت پر مضبوطی سے عمل پیرا ہوں۔ امام ابوجعفر طحاویؒ فرماتے ہیں: ''عترت'' سے مراد آپ ﷺ کے وہ اہل بیت ہیں جو آپ کے ہم مذہب ہیں، اور آپ ﷺ کے حکم پر مضبوطی سے عمل پیرا ہیں''۔

خلاصہ یہ کہ اس حدیث (حدیث الثقلین) میں قرآن کے مقابلے میں ''اہل بیت'' کا تذکرہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح آپ ﷺ کے ارشاد (فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين) میں آپ ﷺ کی سنت کے ساتھ خلفائے راشدین کی سنت کا تذکرہ ہے۔

گزشتہ سطور کی تشریح کو اگر آپ سامنے رکھیں، تو آپ کے سامنے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجائے گی کہ حدیث ثقلین (جس میں عترت کا لفظ آیا ہے) مؤطا کی اس حدیث کا قوی شاہد ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

"تركت فيكم أمرين، لن تضلوا ما تمسكتم بهما: كتاب الله وسنة رسوله"۔ (۴۵)

علما وشارحین حدیث کے ان اقوال سے یہ بات اچھی طرح کھل کر سامنے آگئی کہ حدیث کے جن طرق میں ''عترت'' کا لفظ آیا ہے، ان میں دراصل سنت کا نام لینے کی بجائے سنت کے ایک مستند ماخذ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے عترت والی روایات بھی مآل اور انجام کے لحاظ سے ''سنت'' کی ہی اتباع کی دعوت دیتی ہیں۔ اس طرح ''سنت'' اور ''عترت'' والے طرق میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ مسلمانوں کو شیعہ اور سنی دو خیموں میں بانٹتے ہیں۔ ہاں ان سے غلط مطلب نکال کر کوئی منقسم ہوجائے، تو اس میں اس روایت کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بہت سے لوگوں نے تو قرآنی آیات سے غلط مطلب نکال کر گمراہ کن نظریات ایجاد کیے ہیں، تو کیا ان کے غلط فہم کی وجہ قرآن مشتبہ ہوجائے گا؟

تنبیہ

عترت النبی میں سارے بنی ہاشم داخل ہیں۔ مثلاً: حضرت عباسؓ کی اولاد اور حضرت علیؓ

کی اولاد، حارث بن عبدالمطلب کی اولاد، اور ابو طالب کے تمام بیٹے۔(۴۶)۔اس میں صرف حضرت علیؓ اوران کے دونوں صاحبزادے حسنؓ اور حسینؓ اوران کی اولاد ہی شامل نہیں ہیں جیسا کہ فرقہ امامیہ اثناعشریہ کا خیال ہے۔اسی طرح اہل بیت میں ازواج مطہراتؓ بھی شامل ہیں۔مزید یہ کہ اللہ کے نبی ﷺ سے جن صحابہ نے سب سے زیادہ روایتیں نقل کی ہیں اور علم وثقہ کے لحاظ سے بھی ممتاز ہیں، ان میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کو خصوصی مقام حاصل ہے، تو وہ اس حدیث میں سب سے پہلے شامل ہیں۔مزید یہ کہ عترت کے اندر ایسا عموم بھی نہیں ہے کہ آج کے پس منظر میں ہر اہل بیت اس میں شامل ہو جائے، خواہ وہ ملحد اور دہریہ، یا فاسق فاجر اور بے نمازی و بدکردار ہی کیوں نہ ہو!(۴۷)

حواشی وحوالہ جات

(۱) ادراک زوال امت:۱/ ۲۱۷۔

(۲) حوالۂ بالا:۱/ ۲۱۷-۲۱۸۔

(۳) ازواج مطہرات میں: حضرت عائشہؓ سے ۲۲۱۰، حضرت ام سلمہؓ سے ۳۷۸، حضرت میمونہؓ سے ۷۶، حضرت ام حبیبہؓ سے ۶۵، حضرت حفصہؓ سے ۶۰، حضرت صفیہؓ سے ۱۰، حضرت جویریہؓ سے ۷، حضرت سودہؓ سے ۵ اور حضرت خدیجہؓ سے ۱/ حدیث مروی ہے۔ دیگر اہل بیت میں: حضرت عباسؓ سے ۳۵، حضرت ابن عباسؓ سے ۱۶۶۰، حضرت علیؓ سے ۵۳۷، حضرت فاطمہؓ سے ۱۸ اور حضرت حسینؓ سے ۸/ حدیثیں مروی ہیں۔دیکھیے: أسماء الصحابة وما لكل واحد منهم من العدد۔

(۴) تفہیمات:۱/ ۳۴۵۔

(۵) حوالۂ بالا:۱/۱۶۳-۱۶۴۔

(۶) حوالۂ بالا:۱/ ۳۵۵-۳۵۶۔

(۷) أخرجه البزار:۸۶۴/ وأبونعيم في حلية الأولياء:۹/۶۴۔

(۸) أخرجه أحمد:۱۱۱۱۹/ أبو يعلى :۱۰۲۷/ ابن سعد فى الطبقات الكبرى:۲/۱۹۴/ الطبرانى فى المعجم الكبير:۳/۶۶، رقم :۲۶۷۹۔

(۹) أخرجه الخطيب فى المتفق والمفترق:۲/۳۱۔

(۱۰) أخرجه ابن أبي عاصم في السنة: ۱۴۶۵۔

(۱۱) أخرجه بقي بن مخلد في الحوض والكوثر: ۱۶/ الطبرانی في المعجم الکبیر: ۳۰۵۲، و۲۶۸۳/ وأبونعیم في الحلیة: ۱/ ۳۵۵۔

(۱۲) أخرجه أحمد: ۱۹۳۳۲/ الطبرانی في المعجم الکبیر: ۳/ ۶۶، ۵/ ۱۶۷/ البزار: ۴۳۲۵/ النسائی في السنن الکبری: ۸۴۶۴/ الطحاوی في شرح مشکل الآثار: ۱۷۶۵۔

(۱۳) أخرجه أحمد: ۲۱۶۱۸/ ابن شیبة في المصنف: ۳۲۳۳۷/ الطبرانی في المعجم الکبیر: ۵/ ۱۵۳، رقم: ۴۹۲۱۔

(۱۴) أخرجه الطبرانی کما في مجمع الزوائد: ۵/ ۱۹۸۔

(۱۵) أورده الذهبی في نسخة نُبیط: ۲۹۔

(۱۶) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن أبی طالب، رقم: ۶۲۲۵۔

(۱۷) المفہم لما أشکل من تلخیص کتاب مسلم: ۲۰/ ۵۱۔

(۱۸) تفسیر ابن کثیر: ۷/ ۲۰۱۔

(۱۹) مجموع فتاوی ابن باز: ۳/ ۳۷۔

(۲۰) ایضاً: ۹/ ۳۴۔

(۲۱) أخرجه اسحاق بن راہویہ کما في ''إتحاف الخیرة المہرة للبوصیری: ۷/ ۲۱۰/ المطالب العالیہ'' لابن حجر: ۴/ ۲۵۲/ الطحاوی في شرح مشکل الآثار'': ۱۷۶۰۔

(۲۲) أخرجه عبد بن حمید في مسنده: ۲۴۰۔

(۲۳) أخرجه الترمذی: ۳۷۸۸/ الفسوی في المعرفة والتاریخ: ۱/ ۵۳۶]۔

(۲۴) أخرجه الترمذی: ۳۷۸۶/ الطبرانی في المعجم الکبیر: ۳/ ۶۶، رقم: ۲۶۸۰۔

(۲۵) أخرجه أحمد: ۱۱۵۷۸/ ابن أبی عاصم في السنه: ۱۵۵۳/ أبویعلی: ۱۱۴۰/ البغوی في شرح السنه: ۳۹۱۴۔

(۲۶) أخرجه بحشل في تاریخ واسط: ۵۰۔

(۲۷) أخرجه البیہقی في شعب الایمان: ۳۳۱۵/ السخاوی في الأجوبة المرضیة: ۲/ ۵۴۶۔

(۲۸) أخرجه الحاکم في المستدرک، والمروزی في السنة: ۶۸/ العقیلی في الضعفاء الکبیر: ۲/ ۲۵۰، رقم: ۳۱۸/ البیہقی في دلائل النبوة: ۵/ ۴۴۹۔

(۲۹) أخرجه أبونعیم في تاریخ أصبهان: ۱/ ۱۳۸۔

(۳۰) أخرجه البزار: ۸۹۹۳/ العقیلی في الضعفاء الکبیر: ۲/ ۲۵۰/ ابن عدی في الکامل في الضعفاء: ۴/ ۶۹/ الدارقطنی: ۴/ ۲۴۵/ الحاکم: ۴۳۲۱۔

(۳۱) أخرجه الخطیب في الفقیه والمتفقه: ۱/ ۲۷۵۔

(۳۲) أخرجہ البیہقی فی دلائل النبوۃ:۵/ ۴۴۸۔

(۳۳) أخرجہ الطبری في تاریخہ:۱۲/ ۱۸۱۔

(۳۴) أخرجہ ابن عبدالبر فی جامع بیان العلم وفضلہ:۱۳۸۹/ الشجري فی ترتیب الأمالی:۷۵۳۔

(۳۵) أخرجہ البیہقی فی دلائل النبوۃ:۵/ ۴۴۸۔

(۳۶) أوردہ الواقدی فی مغازیہ:۲/ ۵۷۷۔

(۳۷) أخرجہ مالک بلاغاً فی ''الموطأ'':۲/ ۸۹۹۔

(۳۸) دیکھیے: الفائق للزمخشری:۱/ ۱۷۰۔

(۳۹) شرح صحیح مسلم:۱۵/ ۱۸۰۔

(۴۰) روضۃ الناظر:۱/ ۴۷۰۔

(۴۱) الإحکام فی أصول الأحکام:۱/ ۳۰۸۔

(۴۲) منہاج السنۃ النبویۃ:۷/ ۳۹۳-۳۹۷۔

(۴۳) الصواعق المحرقۃ:۲/ ۴۳۹۔

(۴۴) مرقاۃ المفاتیح:۹/ ۳۹۷۵۔

(۴۵) سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ:۴/ ۲۶۰۔

(۴۶) دیکھیے: ''النہایہ في غریب الحدیث والأثر لابن أثیر، مادہ (عتر)/ منہاج السنۃ النبویہ لابن تیمیۃ :۷/ ۳۹۵/ التنویر شرح الجامع الصغیر للصنعانی:۲/ ۳۷۶۔

(۴۷) ''حدیث الثقلین'' کے حوالے سے یہ ساری بحث درحقیقت شیخ ''علوی بن عبدالقادر السقاف نے ''حدیث الثقلین: ''كتاب الله وعترتي''،''كتاب الله وسنتي'':دراسة حديثية فقهية '' کے زیر عنوان بیان فرمائی ہے۔راقم نے خفیف سی ترمیم کے ساتھ اس کی تلخیص وترجمانی پیش کردی ہے۔تفصیل کے لیے دیکھیے: Dorar.net)

☆☆☆

فکرونظر

دورِحاضر میں مسئلۂ تحفظ ختم نبوت
(کرنے کے کام، منصوبے اور طریقۂ عمل)

محمد رضی الرحمان قاسمی
raziqasmi@gmail.com

تحریر سے پہلے

- اس تحریر میں تحفظِ ختم نبوت کے سلسلے میں جو مختلف عملی تجاویز پیش کی گئی ہیں، اُن کا مقصد (العیاذ باللہ) ہرگز یہ تاثر دینا نہیں ہے کہ اس موضوع پر ماضی میں کوئی کام نہیں ہوا ہے یا حال میں نہیں ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علمائے کرام، جماعتوں اور تنظیموں نے ہر دور میں اس عقیدے کے تحفظ کے لیے بے شمار اور گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ البتہ یہ تجاویز موجودہ دور کے مخصوص فکری، سماجی اور قانونی چیلنجز کو سامنے رکھ کر ترتیب دی گئی ہیں؛ تاکہ ان حالات میں مکمل اور مؤثر رہنمائی فراہم کی جاسکے۔ اس تحریر میں آپ کو وہ مشورے اور تجاویز بھی ملیں گی، جن پر بہتر طریقے سے آج کے عہد میں بھی کام ہو رہا ہے؛ لیکن چونکہ مقصود مکمل پلان کو پیش کرنا ہے؛ اس لیے ان کا ذکر بھی ناگزیر تھا۔ وجہ ہرگز یہ نہیں کہ اس پہلو سے ہونے والے کام کی نفی کی جائے یا اس کی اہمیت کو کم کیا جائے۔
- موجودہ دور میں جو کام ہمیں انجام دینا ہے، وہ لازماً سلفِ صالحین کے علمی ورثے اور فکری رہنمائی کی روشنی میں ہونا چاہیے۔ ان کے منہج کو بنیاد بنا کر ہی ہم حالات اور تقاضوں کے مطابق ایسے اقدامات کرسکتے ہیں جو صحیح رخ اور فکری اعتدال کے ساتھ آگے بڑھنے کا ذریعہ بنیں۔
- اس تحریر میں شامل کچھ تجویزیں بعض قارئین کو اپنے مخصوص حالات کے تناظر میں غیر عملی

محسوس ہوسکتی ہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تحفظِ ختمِ نبوت کا مسئلہ محض مقامی نہیں؛ بلکہ ایک عالمی مسئلہ ہے، اور یہ تحریر اسی عالمی تناظر کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔بعض نکات انفرادی سطح سے متعلق ہیں، کچھ اجتماعی اور سماجی سطح سے، کچھ مسلم حکومتوں کی ذمہ داریوں سے، اور کچھ ایسے تقاضوں سے جو غیر مسلم ممالک میں رہنے والے مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں۔اس لیے ہر شخص کو اپنی حیثیت، مقام اور حالات کے مطابق یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ کس حد تک اور کس دائرے میں اپنا کردار ادا کرسکتا ہے۔

باب اول: بنیادی تصورات اور نظریاتی بنیادیں

الف: ختمِ نبوت کا عقیدہ-قرآن وسنت کی روشنی میں

عقیدۂ ختمِ نبوت اسلام کے ان بنیادی اور متفق علیہ عقائد میں سے ہے جن پر اُمتِ مسلمہ کا ہر دور میں اجماع رہا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت اور رسالت کا جو سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا تھا، وہ نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر آکر اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔اب آپ ﷺ کے بعد کوئی نیا نبی یا رسول نہیں آئے گا اور قیامت تک انسانیت کی رہنمائی کا ذریعہ قرآن وسنت ہی رہیں گے۔

- قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس عقیدے کو نہایت واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔سورۃ الاحزاب کی آیت 40 اس سلسلے میں سب سے صریح نص ہے: ''مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيماً ''۔

ترجمہ: "محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں؛ لیکن وہ اللہ کے رسول اور تمام نبیوں کے خاتم (مہر، آخر میں آنے والے) ہیں، اور اللہ ہر چیز کا خوب علم رکھنے والا ہے۔" (الاحزاب:40)

اس آیت میں "خَاتَمَ النَّبِيِّينَ" کا لفظ کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔عربی لغت میں "خاتم" کا مطلب مُہر (Seal) اور کسی سلسلے کی آخری کڑی ہے۔جس طرح مہر کسی چیز کو بند کر کے محفوظ کر دیتی ہے، اسی طرح نبی اکرم ﷺ کی آمد نے نبوت کے دروازے کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے۔

تمام صحابہ، تابعین، مفسرینِ کرام، علمائے عظام اور پوری امت نے اس آیت سے یہی مفہوم سمجھا ہے کہ آپ ﷺ آخری نبی ہیں۔

- **احادیثِ مبارکہ میں ختمِ نبوت کی تصریحات**

نبی اکرم ﷺ نے خود اپنی متعدد احادیث میں اس عقیدے کی وضاحت فرمائی ہے۔ علما کی تلاش وتتبع اور تحقیق کے مطابق ختمِ نبوت کے موضوع پر سو سے زائد احادیث وآثار موجود ہیں۔ چند مشہور احادیث درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِن مُوسَى، إِلَّا أَنَّهُ لا نَبِيَّ بَعْدِي ''۔ (تم میرے لیے ایسے ہی ہو جیسے موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے ہارون (علیہ السلام) تھے، مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں)۔ (۱)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مَثَلِي ومَثَلُ الأَنبِياءِ مِن قَبلِي كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنَى بُنيانًا فأَحسَنَهُ وأَجمَلَهُ، إِلَّا مَوضِعَ لَبِنَةٍ مِن زاوِيَةٍ مِن زَواياهُ، فَجَعَلَ النَّاسُ يَطُوفُونَ به ويَعْجَبُونَ له ويقولونَ: هَلّا وُضِعَتْ هذِه اللَّبِنَةُ قالَ فأنا اللَّبِنَةُ، وأنا خاتَمُ النبيِّينَ ''۔ (میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیا کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک بہت ہی حسین وجمیل محل بنایا، مگر اس کے ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ لوگ اس محل کے گرد پھرتے اور اس کی خوبصورتی پر حیرت کا اظہار کرتے، مگر کہتے کہ یہ ایک اینٹ (بھی) کیوں نہ رکھ دی گئی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''پس وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین (نبیوں کا ختم کرنے والا) ہوں''۔ (۲)

- **اس بابت صحابہ کرام اور تابعین کا قول وعمل**

رسول اللہ ﷺ کے وصال کے فوراً بعد جب بعض افراد (مثلاً مسیلمہ کذاب، اسود عنسی وغیرہ) نے نبوت کے جھوٹے دعویٰ کا زور وشور سے پروپیگنڈا شروع کیا تو تمام صحابۂ کرام نے اس کی تکذیب اور شدت سے رد پر ذرا بھی تامل نہیں کیا اور اسے دین سے ارتداد قرار دیا۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مسیلمہ کذاب اور دیگر جھوٹے مدعیانِ نبوت کے خلاف جنگ

کا اعلان کیا، جس میں ہزاروں صحابہ نے حصہ لیا اور بہتوں نے اس عقیدے کی حفاظت کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ یہ صحابۂ کرام کا اس بات پر "اجماعِ عملی" تھا کہ آپ ﷺ کے بعد نبوت کا کوئی بھی دعویدار کافر اور واجب القتل ہے۔ (۳)

ب: تاریخی تناظر میں ختمِ نبوت کا تحفظ

اسلامی تاریخ کے ہر دور میں اس عقیدے کے تحفظ کے لیے امت نے ہر ممکن کوشش کی ہے۔

- **اسلامی تاریخ میں مدعیانِ نبوت کا ظہور:** نبوت کے جھوٹے دعویداروں کا فتنہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری ایام میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ مسیلمہ کذاب سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ بعد کے ادوار میں بھی جاری رہا، جیسے مغیرہ بن سعید عجلی، حارث کذاب، اسحاق اخرس، عبد العزیز باسندی، عبدالعزیز طرابلسی اور دورِ جدید میں مرزا غلام احمد قادیانی وغیرہ۔
- **علمائے امت کا کردار اور ردِ عمل:** ہر دور میں جب بھی کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا، علمائے امت نے فکری اور علمی محاذ پر اس کا بھرپور رد کیا۔ انھوں نے کتابیں لکھیں، مناظرے کیے، اور عوام الناس کو اس فتنے کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ بڑے بڑے علما نے اس عقیدے کے تحفظ میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔
- **مختلف ادوار میں تحفظی اقدامات:** علما کے علمی کام کے ساتھ ساتھ مسلم حکمرانوں نے بھی ہمیشہ اس فتنے کے خلاف عملی اقدامات کیے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی جنگِ یمامہ سے لے کر مختلف ادوار میں ایسے دعویداروں کے خلاف قانونی اور عسکری کاروائیاں کی گئیں۔ دورِ جدید میں پڑوسی ملک پاکستان کی پارلیمنٹ نے 1974 میں متفقہ طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا، جو اس عقیدے کے تحفظ کے لیے ایک اہم آئینی قدم تھا۔

ج: جدید دور میں ختمِ نبوت کے چیلنجز

موجودہ دور میں اس عقیدے کو کچھ نئے اور پیچیدہ چیلنجز کا سامنا ہے:

- **مستشرقین کے اعتراضات اور شبہات:** کچھ مغربی مستشرقین (Orientalists) نے اسلامی عقائد پر شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ انھوں نے "خاتم النبیین" کی ایسی تاویلات پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جو امت کے متفقہ موقف کے خلاف ہے، مثلاً یہ کہ اس

کا مطلب "افضل النبیین" ہے نہ کہ "آخری نبی"۔ اگرچہ علمی طور پر یہ تاویلات کمزور ہیں؛ لیکن عام ذہنوں میں الجھن پیدا کرنے کا سبب بنتی ہیں۔

• **فرقہ وارانہ تحریکات کا کردار:** برصغیر میں مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریک (احمدیہ/ قادیانیت) اس دور کا سب سے بڑا فتنہ ہے جس نے نبوت کے جاری رہنے کا دعویٰ کیا۔ ان لوگوں نے قرآنی آیات اور احادیث کی ایسی تاویلات کیں جو امت کے تقریباً 1500 سالہ اجماعی موقف سے ٹکراتی ہیں۔ اس تحریک نے امتِ مسلمہ کے اندر ایک بڑے فکری انتشار کو جنم دیا۔

• **جدید فکری رجحانات کا اثر:** عصرِ حاضر کے بعض فکری رجحانات، جیسے مذہبی تجربے کی عالمگیریت (Universalism of Religious Experience) یا یہ تصور کہ ہر دور کو اپنے "مصلح" یا "نبی" کی ضرورت ہوتی ہے، بالواسطہ طور پر ختمِ نبوت کے تصور کو چیلنج کرتے ہیں۔ یہ نظریات وحی اور نبوت کے نظام کو ایک شخصی یا سماجی ارتقائی عمل قرار دیتے ہیں، جو اسلامی تصورِ نبوت سے میل نہیں کھاتا۔

باب دوم: معاصر خطرات اور چیلنجز کا تجزیہ

عقیدۂ ختمِ نبوت کی نظریاتی بنیادوں کو سمجھنے کے بعد، اب ہم ان جدید خطرات اور چیلنجز کا گہرائی سے جائزہ لیں گے جن کا اس عقیدے کو آج کے دور میں سامنا ہے۔ یہ چیلنجز فکری، ابلاغی اور تعلیمی نوعیت کے ہیں اور ان کا تجزیہ مستقبل کی حکمتِ عملی مرتب کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

الف: فکری و نظریاتی چیلنجز

یہ چیلنجز براہِ راست عقیدے کی فکری بنیادوں پر حملہ آور ہوتے ہیں اور جدید ذہن میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

• **مغربی فکر میں مذہبی تکثیریت (Religious Pluralism) کا تصور:** مذہبی تکثیریت کا مغربی تصور یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ تمام مذاہب سچائی تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں اور کوئی ایک مذہب حتمی اور آخری نجات کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یہ نظریہ بظاہر بہت دلکش اور رواداری

پر مبنی لگتا ہے؛ لیکن یہ اسلام کے بنیادی تصورات سے متصادم ہے۔ اسلام خود کو دینِ کامل (المائدۃ: 3) اور نبی اکرم ﷺ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت (الانبیاء: 107) قرار دیتا ہے۔ مذہبی تکثیریت کا نظریہ جب مسلم معاشروں میں سرایت کرتا ہے تو یہ عقیدۂ ختمِ نبوت کی اہمیت کو کمزور کر دیتا ہے۔ نوجوان ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہوسکتا ہے کہ اگر تمام راستے درست ہیں تو پھر نبوت کے سلسلے کے ختم ہونے پر اصرار کیوں؟ (Joseph Hick, "An Interpretation of Religion: Human Responses to the Transcendent")

- **سیکولر تعلیمی نظام کے اثرات:** جدید ریاستوں میں رائج سیکولر تعلیمی نظام کی بنیاد دین کو انفرادی اور ذاتی معاملہ قرار دینے پر ہے۔ اس نظام میں دینی عقائد، بالخصوص ختمِ نبوت جیسے حساس موضوعات کو نصاب کا حصہ نہیں بنایا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ ایک پوری نسل ایسی تیار ہوتی جا رہی ہے جو اپنے دین کی بنیادی تعلیمات اور عقائد کی اہم باتوں سے ناواقف ہوتی ہے۔ جب اس نسل کا سامنا سوشل میڈیا یا دیگر ذرائع سے گمراہ کن پروپیگنڈے سے ہوتا ہے، تو علمی بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے وہ آسانی سے شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتی ہے۔
- **مذہبی رواداری کے نام پر پیدا ہونے والے شبہات:** "مذہبی رواداری" ایک مثبت قدر ہے؛ لیکن اس کی غلط تشریح خطرناک نتائج پیدا کرسکتی ہے۔ ختمِ نبوت کے منکرین کو جب دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا جاتا ہے تو بعض جدید ذہن اسے "عدمِ رواداری" یا "انتہا پسندی" قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کسی کے عقیدے پر فیصلہ سنانے کا حق کس کو ہے؟ یہ سوچ اس بنیادی نکتے کو نظر انداز کر دیتی ہے کہ ہر مذہب اور نظریے کی اپنی متعین حدود (Red Lines) ہوتی ہیں۔ جس طرح کوئی خود کو کمیونسٹ کہہ کر سرمایہ دارانہ اصولوں کی وکالت نہیں کرسکتا، اسی طرح کوئی شخص نبی اکرم ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے یا کسی نئے (جھوٹے) نبی کو مانے، تو اسے دائرۂ اسلام میں شمار نہیں جاسکتا۔ یہ دین کے اصول کا معاملہ ہے، ذاتی پسند یا ناپسند کا نہیں۔

ب: ابلاغ و میڈیا کے چیلنجز

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دور میں ابلاغی محاذ سب سے بڑا میدانِ جنگ بن چکا ہے۔

- **سوشل میڈیا پر مخالف پروپیگنڈا:** فیس بک، یوٹیوب، ٹوئٹر اور واٹساپ جیسے پلیٹ

فارمز ختمِ نبوت کے خلاف پروپیگنڈے کے لیے بڑے پیمانے پر استعمال ہو رہے ہیں۔ جھوٹے مدعیانِ نبوت کے پیروکار اور اسلام مخالف گروہ منظّم طریقے سے پرکشش عنوانات، ڈیزائنز اور ویڈیوز کے ذریعے اپنا مواد پھیلاتے ہیں۔ ان کا ہدف عموماً وہ نوجوان ہوتے ہیں جو علمی طور پر کمزور اور فوری معلومات پر انحصار کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہاں مواد کی کوئی جانچ پڑتال نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے جھوٹ اور سچ میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

- **انٹرنیٹ پر گمراہ کن مواد کا پھیلاؤ:** انٹرنیٹ پر ایسی سیکڑوں ویب سائٹس، بلاگز اور آن لائن لائبریریاں موجود ہیں جو قادیانیت جیسی تحریکات کے نظریات کو فروغ دیتی ہیں۔ ان کے ذریعے قرآن و حدیث کے حوالوں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر اور ان کے من مانے تراجم اور تشریحات پیش کر کے عام قاری کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چونکہ یہ مواد سرچ انجن پر آسانی سے دستیاب ہوتا ہے، اس لیے کوئی بھی عام شخص جو تحقیق کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ سب سے پہلے ان ہی گمراہ کن مواد تک پہنچتا ہے۔
- **جدید ابلاغی ذرائع کا منفی استعمال:** سوشل میڈیا کے علاوہ پوڈ کاسٹس، آن لائن گیمنگ پلیٹ فارمز اور اسٹریمنگ سروسز کو بھی subtly (بڑی منظّم چالبازی سے) نظریاتی جنگ کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ مکالموں، کرداروں یا کہانیوں کے ذریعے ایسے خیالات داخل کیے جاتے ہیں جو نبوت، وحی اور دیگر اسلامی عقائد کی حساسیت کو کم کرتے ہیں۔

ج: تعلیمی اور تربیتی خلا

یہ چیلنجز دراصل ہماری اپنی داخلی کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہیں، جو مخالفین کو مواقع فراہم کرتی ہیں۔

- **نوجوان نسل میں عقیدے کی کمزوری:** گھروں میں دینی تربیت کے فقدان اور اسکولوں میں صرف دنیاوی تعلیم پر زور دینے کے نتیجے میں نوجوان نسل کی اپنے عقائد سے وابستگی کمزور ہو رہی ہے۔ وہ اسلام کو صرف چند رسومات کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور اس کی فکری و نظریاتی گہرائی سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ اس کمزوری کی وجہ سے وہ کسی بھی مخالف نظریے سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔
- **مذہبی تعلیم کا فقدان:** دنیوی یا عصری تعلیم دینے والے اداروں میں دینی تعلیم اکثر یا تو

سرے سے شامل ہی نہیں ہوتی، اور اگر شامل ہوتی بھی ہے تو وہ عمومی طور پر غیر معیاری اور سطحی ہوتی ہے۔ خاص طور پر عقیدۂ ختمِ نبوت جیسے اہم اور بنیادی عقائد کو یا تو بالکل نظرانداز کر دیا جاتا ہے، یا صرف رسمی طور پر چند جملوں میں پڑھا دیا جاتا ہے، جب کہ موجودہ فکری و تہذیبی چیلنجز کے تناظر میں ان کی گہری، عقلی اور مدلل وضاحت کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

- **دینی تعلیمی اداروں میں موضوع کی اہمیت کے صحیح ادراک کا فقدان:** اسکولوں اور کالجوں کا ذکر تو الگ رہا، خود دینی جامعات اور مدارس کے نصاب میں بھی بسا اوقات تحفظِ ختمِ نبوت کے موضوع کو ایک مستقل اور ترجیحی مضمون کے طور پر شامل نہیں کیا جاتا۔ اسے دیگر عقائد کے ضمن میں سرسری طور پر پڑھا دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ایسے علما اور اسکالرز تیار نہیں ہو پاتے جو اس محاذ پر امت کی مؤثر رہنمائی کر سکیں۔

باب سوم: تحفظی حکمت عملیاں اور عملی اقدامات

پچھلے صفحات میں، عصر حاضر میں عقیدۂ ختمِ نبوت کو درپیش جدید چیلنجز کا جائزہ لیا گیا؛ لیکن صرف مسائل کی نشاندہی کرنا کافی نہیں ہے؛ بلکہ ان کا حل تلاش کرنا اور ایک جامع حکمتِ عملی وضع کرنا اصل مقصد ہے۔ یہ باب ان عملی اقدامات اور منصوبوں پر روشنی ڈالے گا جو علمی، تعلیمی اور عوامی سطح پر اختیار کیے جانے چاہییے۔

الف: علمی و تحقیقی اقدامات

فکری چیلنجز کا مقابلہ فکری اور علمی سطح پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس محاذ پر ٹھوس اور مدلل کام کی اشد ضرورت ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ اس موضوع پر علمائے سلف نے لٹریچر کا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے؛ لیکن موجودہ چیلنجز کے تناظر میں اس محاذ پر ان کاموں کی ہنوز ضرورت ہے:

- **تحقیقی مقالات اور کتب کی تصنیف**

سب سے پہلا قدم اعلیٰ پائے کا تحقیقی مواد تیار کرنا ہے۔ قرآن و سنت کے ساتھ علمائے سلف کے تیار کردہ ذخیرے سے استفادہ کرتے ہوئے ایسی کتب اور مقالات لکھے جائیں جو:

۱۔ **جدید اسلوب میں ہوں:** پرانے اور روایتی انداز کے بجائے جدید علمی زبان اور طرزِ

استدلال کو اپنایا جائے جو نئی نسل کے لیے قابلِ فہم اور دلکش ہو۔

۲۔ **عقلی دلائل پر مبنی ہوں:** صرف نقلی دلائل (قرآن وحدیث کے حوالے) ہی نہیں؛ بلکہ عقلی، منطقی اور فلسفیانہ دلائل سے بھی جدید اسلوب میں ختمِ نبوت کی ضرورت اور حکمت کو ثابت کیا جائے؛ کیوں کہ نبوت اور ختم نبوت کا عقیدہ دین کے اساسیات میں ہے اور اساسیات کو نقلی اور عقلی دونوں طرح کے دلائل سے ثابت کرنا ضروری ہوتا ہے۔

۳۔ **مخالفین کے شبہات کا جواب دیں:** مستشرقین، قادیانیوں اور دیگر منکرین کی طرف سے اٹھائے گئے ایک ایک اعتراض کا ٹھوس اور علمی جواب دیا جائے۔ اس سلسلے میں عالمی سطح کے اسلامی تحقیقی اداروں کو منصوبے شروع کرنے چاہیے اور ان کتب کا انگریزی، عربی، فرانسیسی سمیت دنیا کی بڑی زبانوں میں ترجمہ کروانا چاہیے۔

- **علمی کانفرنسز اور سیمینارز کا انعقاد**

قومی اور بین الاقوامی سطح پر سیمینارز اور کانفرنسز کا انعقاد کیا جائے جہاں دنیا بھر سے مسلم اسکالرز، محققین اور دانشور جمع ہوں۔ ان اجتماعات کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ اس موضوع پر ہونے والی نئی تحقیقات کا تبادلہ کریں، ابھرتے ہوئے فتنوں کا جائزہ لیں اور ان کے تدارک کے لیے مشترکہ حکمتِ عملی ترتیب دیں۔ یہ کانفرنسز صرف علما تک محدود نہ ہوں، بلکہ یونیورسٹیوں کے پروفیسرز اور طلبہ کو بھی ان میں شامل کیا جائے۔

- **تقابلی مطالعات (Comparative Studies) کی ترویج**

اسلامی جامعات اور مدارس میں ''تقابلِ ادیان'' یا ''Comparative Religions'' کے شعبوں کو مضبوط کیا جائے۔ جب ایک طالب علم دوسرے مذاہب (یہودیت، عیسائیت، ہندومت) میں نبوت کے تصور، ان کے الہامی صحیفوں کی تاریخ اور ان میں تحریف کی حقیقت کو علمی انداز میں پڑھتا ہے، تو اسے خود بخود اسلام کے تصورِ نبوت اور ختمِ نبوت کی آفاقی حکمت سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہ مطالعہ دفاعی پوزیشن کے بجائے ایک پراعتماد اور مثبت رویہ پیدا کرتا ہے۔

ب: تعلیمی وتربیتی پروگرامز

نئی نسل کو فکری حملوں سے بچانے کا سب سے مؤثر طریقہ ایک مضبوط تعلیمی اور تربیتی نظام ہے۔

• **نصاب میں موضوع کا مؤثر اضافہ:** حکومتی سطح پر (مسلم ملکوں میں) اور اجتماعی سطح پر (ہندوستان جیسے ملکوں میں) یہ کوشش کی جانی چاہیے کہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی اسلامیات کی کتب میں عقیدۂ ختمِ نبوت کے موضوع کو جامع اور مؤثر انداز میں شامل کیا جائے۔

o **پرائمری سطح پر:** کہانیوں اور آسان مثالوں سے نبی اکرم ﷺ کی زندگی اور آپ کے آخری نبی ہونے کا تصور دیا جائے۔

o **سیکنڈری سطح پر:** قرآن وحدیث کے بنیادی دلائل اور اس پر امت کے اجماع کو شامل کیا جائے۔

o **اعلیٰ ثانوی اور یونیورسٹی سطح پر:** اس عقیدے کی عقلی وضاحت، جدید چیلنجز اور ان کے جوابات کو نصاب کا حصہ بنایا جائے۔

• **اساتذہ کی تربیت اور تیاری:** نصاب میں تبدیلی اس وقت تک کارگر نہیں ہوسکتی جب تک اسے پڑھانے والے اساتذہ خود تربیت یافتہ نہ ہوں۔ اسلامیات کے اساتذہ کے لیے خصوصی تربیتی ورکشاپس (Teacher Training Workshops) منعقد کی جائیں، جن میں انھیں اس حساس موضوع کو پڑھانے کی جدید تکنیک، ضروری علمی مواد اور طلبا کے ممکنہ سوالات کے جوابات دینے کی تربیت دی جائے۔

• **طلبہ کے لیے خصوصی ورکشاپس:** تعلیمی اداروں میں طلبہ کے لیے انٹریکٹو سیشنز اور ورکشاپس کا انعقاد کیا جائے، جہاں وہ بغیر کسی جھجک کے اپنے شکوک وشبہات اور سوالات پیش کر سکیں۔ ان ورکشاپس میں ماہر اساتذہ اور اسکالرز، طلبہ کے ساتھ دوستانہ ماحول میں گفتگو کریں اور انھیں مطمئن کریں۔

ج: عوامی آگاہی اور شعوری بیداری

یہ فکری جنگ صرف علمی اور تعلیمی اداروں میں نہیں لڑی جاسکتی؛ بلکہ عوام الناس تک اس پیغام کو پہنچانا بھی ضروری ہے۔

- **خطبات و دروس میں موضوع کا احاطہ:** علما اور خطبا کی ذمہ داری ہے کہ وہ جمعے کے خطبات، قرآنی دروس اور عوامی محفلوں میں عقیدۂ ختمِ نبوت کی اہمیت اور اس کے تقاضوں کو حکمت اور بصیرت کے ساتھ بیان کریں۔ صرف جذباتی انداز اپنانے کے بجائے، عام فہم زبان میں اس کے دلائل اور عملی زندگی میں اس کی اہمیت کو اجاگر کریں۔ خاص طور پر ربیع الاول کے مہینے کو اس مقصد کے لیے بھرپور طریقے سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔
- **پمفلٹس اور کتابچوں کی تقسیم:** عوام الناس کے لیے آسان زبان میں چھوٹے چھوٹے کتابچے اور پمفلٹس تیار کیے جائیں۔ ان میں سوال و جواب کے انداز میں عقیدے کو سمجھایا جائے۔ قرآنی آیات اور احادیث کے آسان تراجم دیے جائیں اور گمراہ کن پروپیگنڈے سے بچنے کی تلقین کی جائے۔ یہ مواد مساجد، بازاروں اور عوامی مقامات پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت جیسی تنظیمیں اس میدان میں دہائیوں سے کام کر رہی ہیں اور ان کا شائع کردہ مواد ایک اچھا نمونہ ہے۔
- **عوامی اجتماعات اور محفلوں کا انعقاد:** شہروں اور قصبوں میں "عظمتِ مصطفیٰ ﷺ و ختمِ نبوت کانفرنس" جیسے عنوانات کے تحت سادگی سے، بے جا اخراجات سے گریز کرتے ہوئے، عوامی اجتماعات منعقد کیے جائیں۔ ان پروگرامز کا مقصد لوگوں کے ایمان کو تازہ کرنا، انھیں اس عقیدے کی اہمیت سے آگاہ کرنا اور امت کے اتحاد کا مظاہرہ کرنا ہو۔

باب چہارم: جدید ٹیکنالوجی کا مثبت استعمال

جس دور میں باطل نظریات کی تشہیر کے لیے ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال ہو رہا ہو، اسی دور میں حق کی آواز کو بلند کرنے کے لیے ان ہی ذرائع کو اپنانا ایک اہم دینی فریضہ ہے۔ پیچھے ابلاغی چیلنجز کا ذکر آیا تھا، ذیل کی سطروں میں ہم دیکھیں گے کہ ان چیلنجز کا ٹیکنالوجی کی زبان میں جواب کیسے دیا جاسکتا ہے۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز، سوشل میڈیا اور دیگر جدید ذرائع کو تحفظِ ختمِ نبوت کے لیے کیسے مثبت اور مؤثر طریقے سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

الف: ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کا استعمال

یہ پلیٹ فارمز علم کے مستقل اور منظّم مراکز کے طور پر کام کر سکتے ہیں۔

- **ویب سائٹس اور بلاگز کا قیام:** جامع، مستند اور صارف دوست (User-Friendly) ویب سائٹ کا قیام پہلا قدم ہے۔اس ویب سائٹ میں:
  - o **مستند مواد:** عقیدۂ ختمِ نبوت پر قرآن، حدیث، اجماعِ امت اور عقلی دلائل پر مبنی مضامین، مقالات اور تحقیقی رپورٹس موجود ہوں۔
  - o **کتب خانہ:** اس موضوع پر لکھی گئی تمام اہم کلاسیکی اور جدید کتب PDF اور دیگر فارمیٹس میں مفت دستیاب ہوں۔
  - o **کثیر اللسانی (Multilingual):** موادصرف اردو میں نہیں؛ بلکہ عربی، انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی اور دیگر علاقائی اور عالمی زبانوں میں بھی فراہم کیا جائے؛ تاکہ پیغام پوری دنیا تک پہنچے۔
  - o **SEO (Search Engine Optimization):** ویب سائٹ کو اس طرح ڈیزائن کیا جائے کہ اگر کوئی شخص گوگل یا دیگر سرچ انجن پر اس موضوع سے متعلق کچھ بھی تلاش کرے تو یہ مستند ویب سائٹ سب سے پہلے نتائج میں نظر آئے۔
- **موبائل ایپلیکیشنز کی تخلیق:** آج کل لوگ ویب سائٹس سے زیادہ موبائل ایپس استعمال کرتے ہیں۔ایسی موبائل ایپ تیار کی جائے جو:
  - o آف لائن کام کرے؛ تاکہ انٹرنیٹ نہ ہونے پر بھی مواد پڑھا جاسکے۔
  - o روزانہ کی بنیاد پر ایک آیت، ایک حدیث یا ایک علمی نکتہ نوٹیفیکیشن کے ذریعے بھیجے۔
  - o "سوال و جواب" کا سیکشن رکھے، جہاں صارفین اپنے سوالات بھیج سکیں اور علما ان کے جوابات دیں۔
- **آن لائن لائبریری کا نظام**

ایک ڈیجیٹل لائبریری قائم کی جائے جو صرف کتابیں ہی نہیں؛ بلکہ دنیا بھر کی جامعات میں لکھے گئے تحقیقی مقالات، علما کے فتاویٰ اور تاریخی دستاویزات کو ایک جگہ جمع کرے۔ یہ

لائبریری محققین،طلبہ اور عام عوام کے لیے ایک انمول خزانہ ثابت ہوگی۔

ب: سوشل میڈیا کا مثبت استعمال

سوشل میڈیا وہ میدان ہے جہاں نظریات کی جنگ سب سے زیادہ لڑی جا رہی ہے۔ اس میدان کو خالی چھوڑنا کسی بھی طور پر مناسب نہیں ہے۔

- **فیس بک، ٹوئٹر اور یوٹیوب کا استعمال**

  o **یوٹیوب:** چھوٹے، معلوماتی اور اعلیٰ معیار کے ویڈیوز بنائے جائیں۔ مثلاً: 2 منٹ کی اینی میٹڈ ویڈیو جو ایک دلیل کو سمجھائے۔ علما کے مختصر کلپس، یا شبہات کے جوابات پر مبنی سیریز۔

  o **فیس بک:** باقاعدگی سے معلوماتی پوسٹس، انفوگرافکس اور لائیو سیشنز کیے جائیں۔ ایک کمیونٹی پیج بنایا جائے جہاں لوگ صحت مندانہ ماحول میں گفتگو کر سکیں۔

  o **ٹوئٹر (ایکس):** مختصر اور جامع پیغامات (Tweets) اور تھریڈز کے ذریعے دلائل پیش کیے جائیں اور اہم ہیش ٹیگز (#KhatmeNabuwwat, #FinalityOfProphethood) کا استعمال کر کے پیغام کو زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے۔

- **انفوگرافکس اور ویڈیو مواد کی تیاری:** آج کا دور تحریر سے زیادہ تصویر اور ویڈیو کا ہے۔ پیچیدہ علمی مباحث کو خوبصورت اور آسان فہم انفوگرافکس (Infographics) میں تبدیل کیا جائے۔ مثال کے طور پر "خاتم النبیین" کے لغوی معنی، آپ ﷺ کے آخری نبی ہونے پر 10 قرآنی دلائل، یا تاریخ کے مشہور جھوٹے نبوت کے دعوے داروں کے انجام کو انفوگرافکس کی شکل میں پیش کرنا زیادہ مؤثر ثابت ہو سکتا ہے۔

- **آن لائن مباحثے اور سوال جواب کے پروگرام:** مستند علما اور اسکالرز کو فیس بک لائیو یا یوٹیوب لائیو پر لایا جائے، جہاں وہ براہِ راست عوام کے سوالات سنیں اور ان کے جوابات دیں۔ اس سے نہ صرف لوگوں کے شبہات دور ہوں گے؛ بلکہ ایک شفاف اور پر اعتماد تعلق بھی قائم ہوگا۔

ج: جدید میڈیا کے ذریعے پیغام رسانی

سوشل میڈیا سے ہٹ کر بھی ابلاغ کے بہت سے مؤثر ذرائع موجود ہیں۔

- **ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگرامز:** سیٹلائٹ، ٹی وی چینلز اور ریڈیو پر اس موضوع کی

مناسبت سے خصوصی پروگرام نشر کیے جائیں۔ان میں سطحی اور جذباتی گفتگو کے بجائے سنجیدہ علمی مباحث، پینل ڈسکشنز اور تحقیقی رپورٹس شامل ہوں۔

- **پوڈکاسٹس اور آڈیو کتب:** پوڈ کاسٹ (Podcast) آج کی نسل میں بہت مقبول ہے۔عقیدۂ ختمِ نبوت کی تاریخ، دلائل اور چیلنجز پر ایک مکمل پوڈ کاسٹ سیریز شروع کی جاسکتی ہے۔اسی طرح، اس موضوع پر لکھی گئی اہم کتابوں کو آڈیو بک (Audiobook) میں تبدیل کر کے ان لوگوں تک پہنچایا جاسکتا ہے جن کے پاس کتاب پڑھنے کا وقت نہیں۔
- **ڈاکیومینٹری فلمز کی تیاری:** اعلیٰ معیار کی ڈاکیومنٹری فلمیں تیار کی جائیں جو تاریخی حوالوں، گرافکس اور ماہرین کے انٹرویوز کے ذریعے عقیدۂ ختمِ نبوت کی پوری تاریخ اور اس کے خلاف اٹھنے والے فتنوں (خصوصاً قادیانیت) کا تحقیقی جائزہ پیش کریں۔ایسی ڈاکیومنٹریز کو نیٹ فلکس جیسے پلیٹ فارمز پر بھی پیش کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے؛ تاکہ دوسرے وہ لوگ، جن کو ہمارے پلیٹ فارم تک رسائی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، ان تک بھی ہم کم از کم صحیح پیغام پہنچانے کی اپنی کوشش سے غفلت نہ برتیں۔

بابِ پنجم: ادارہ جاتی کردار اور تنظیمی حکمت عملی

تحفظِ ختمِ نبوت کی ذمہ داری صرف افراد کی نہیں؛ بلکہ یہ ایک اجتماعی فریضہ ہے جسے معاشرے کے تمام اداروں کو مل کر سرانجام دینا ہے۔ جب تک ہر ادارہ اپنی ذمہ داری کو نہیں پہچانے گا اور ایک منظّم حکمتِ عملی کے تحت کام نہیں کرے گا، کوششیں بکھری رہیں گی اور مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوں گے۔ یہ باب مذہبی، حکومتی اور عوامی اداروں کے کردار کا تفصیلی جائزہ پیش کرتا ہے۔

الف: مذہبی اداروں کا کردار

مذہبی ادارے اس مہم میں ہراول دستے کا کردار ادا کرتے ہیں؛ کیونکہ یہ ان کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

- **مدارس اور جامعات کی ذمہ داری:** دینی مدارس اور اسلامی جامعات وہ فکری قلعے ہیں جہاں سے اس عقیدے کی حفاظت کے لیے علمی سپاہی تیار ہوتے ہیں۔ان کی ذمہ داریوں میں

شامل ہے:

o **نصاب کی تجدید:** اپنے نصاب (Curriculum) میں عقیدۂ ختمِ نبوت اور اس سے متعلق جدید چیلنجز پر خصوصی ابواب اور مضامین شامل کریں۔ صرف روایتی دلائل پر اکتفا نہ کریں؛ بلکہ جدید فلسفے اور فکر کی روشنی میں اٹھنے والے سوالات کا جواب بھی دیں۔

o **تخصص کے شعبوں کا قیام:** "مطالعۂ ختمِ نبوت" یا "تقابلِ ادیان" جیسے خصوصی شعبے (Specialized Departments) قائم کریں جہاں محققین کو اس موضوع پر پی ایچ ڈی اور پوسٹ ڈاکٹریٹ کی سطح پر بھی تحقیق کا موقع ملے۔

o **علما کی تیاری:** ایسے پختہ کار علما اور اسکالرز تیار کریں جو نہ صرف علمی گہرائی رکھتے ہوں؛ بلکہ جدید ٹیکنالوجی، عالمی زبانوں اور نئے اسلوبِ بیان پر بھی عبور رکھتے ہوں۔

• **مساجد اور اسلامی مراکز کا استعمال:** مسجد صرف نماز کی جگہ نہیں؛ بلکہ ایک اسلامی کمیونٹی سینٹر اور تربیتی مرکز ہے۔

o **خطباتِ جمعہ:** ائمہ اور خطبا جمعہ کے منبر کو ایک تعلیمی پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کریں اور حکمت کے ساتھ، لوگوں کے ذہنوں میں اس عقیدے کی اہمیت اور محبت کو راسخ کریں۔

o **دروس کا نظام:** روزانہ یا ہفتہ وار دروس کا اہتمام کریں جن میں عوام الناس کو ان کی اپنی زبان میں اس عقیدے کے دلائل سمجھائے جائیں۔

o **یوتھ کلب:** نوجوانوں کو مسجد سے جوڑنے کے لیے "یوتھ کلب" قائم کریں جہاں ان کی دینی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کے سوالات اور خدشات کو سنا اور دور کیا جائے۔

• **دارالافتا اور فقہی اکیڈمیاں:** دارالافتا اور فقہی کونسلز (Fiqh Academies) امت کی رہنمائی کا اہم ترین مرکز ہیں۔ ان کا کردار یہ ہے کہ وہ اس موضوع سے متعلق پیش آمدہ نئے مسائل، جیسے آن لائن دھوکہ دہی، مغالطات یا گمراہ کن تشریحات پر فوری اور متفقہ فتاویٰ اور علمی موقف جاری کریں؛ تاکہ عوام کسی ابہام کا شکار نہ ہوں۔ عالمی سطح پر اسلامی فقہ اکیڈمی (جدہ)، ہندوستان کی سطح پر مسلم پرسنل لا بورڈ اور فقہ اکیڈمی انڈیا جیسے ادارے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ب: حکومتی اور سرکاری تعاون

ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے بنیادی عقائد کے تحفظ کے لیے اقدامات کرے۔

• **قانونی تحفظ کے اقدامات:** مسلم ممالک کی حکومتوں کو چاہیے کہ وہ آئین اور قانون میں ختمِ نبوت کے عقیدے کو مکمل تحفظ فراہم کریں۔ پاکستان کا آئین اس سلسلے میں ایک مثال ہے، جس میں حضور اکرم ﷺ کو آخری نبی ماننا مسلمان کی تعریف کا لازمی جزو قرار دیا گیا ہے اور قادیانیوں کو ان کے کفریہ عقائد کی بنا پر غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا ہے۔(۴)۔ایسے قوانین کا نفاذ اور ان کی پاسداری حکومت کی ذمہ داری ہے۔

ہندوستان جیسے ملک میں بے وجہ شور و غوغا کے بغیر، ایک منظّم قانونی اور سیاسی جدوجہد کرتے رہنا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے، جو اس بات کو یقینی بنائے رکھے کہ مسلمانوں کے عقائد سے کھلواڑ کی کوشش کی اجازت نہیں ہوگی اور واضح طور پر اس بات کی آزادی ہوگی کہ قادیانی جیسے فرقہ کو مبادیات دین اسلامی کے انکار کی وجہ سے مسلمانوں کا حصہ نہ قرار دیا جائے۔

• **تعلیمی پالیسی میں شمولیت:** (مسلم) حکومت کو اپنی قومی تعلیمی پالیسی میں اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ تمام سرکاری و نجی تعلیمی اداروں کے نصاب میں عقیدۂ ختمِ نبوت کو اس کی اہمیت کے مطابق جگہ دی جائے۔ یہ صرف اسلامیات تک محدود نہ ہو؛ بلکہ اردو جیسے مضامین میں بھی اس کی ثقافتی اور تاریخی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔

• **سرکاری سطح پر آگاہی مہم:** (مسلم) حکومت اپنے سرکاری میڈیا (ٹی وی، ریڈیو) اور محکمۂ اطلاعات کے ذریعے اس موضوع پر قومی سطح کی آگاہی مہم چلا سکتی ہے۔ خاص طور پر جب کوئی نیا فتنہ سر اٹھا رہا ہو تو سرکاری سطح پر مستند معلومات کی فراہمی عوام کو گمراہی سے بچانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

ج: سول سوسائٹی اور رضاکارانہ تنظیموں کا کردار

معاشرے کے باشعور افراد اور تنظیمیں -خاص کر ہندوستان جیسے ملک میں- اس جدوجہد میں کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

- **این جی اوز اور رفاہی اداروں کا تعاون:** سول سوسائٹی کی تنظیمیں (NGOs) اور فلاحی ادارے اس مقصد کے لیے فنڈز فراہم کر سکتے ہیں۔ علمی کانفرنسز کے انعقاد میں مدد دے سکتے ہیں اور مستند مواد کی اشاعت اور تقسیم میں اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں۔
- **مذہبی تنظیموں کا منظّم کردار:** وہ مذہبی تنظیمیں جو خاص طور پر تحفظِ ختمِ نبوت کے لیے کام کر رہی ہیں (جیسے عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت)، ان کے کام کو مزید منظّم اور وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ دنیا بھر میں اپنی شاخیں قائم کریں، جدید ٹیکنالوجی کو اپنائیں اور تمام مسالک کے علما کو اس مقصد کے لیے ایک پلیٹ فارم پر متحد کر کے کام کریں۔
- **کمیونٹی کی سطح پر تعاون:** اصل طاقت کمیونٹی کی سطح پر ہوتی ہے۔ والدین، اساتذہ، اور محلے کے بزرگوں کو مل کر ایک ایسا ماحول بنانا چاہیے جہاں بچوں کی تربیت ان خطوط پر ہو کہ یہ عقیدہ ان کے دل و دماغ میں رچ بس جائے۔ مقامی سطح پر چھوٹے چھوٹے اسٹڈی سرکلز (مطالعاتی حلقے) قائم کیے جائیں جہاں نوجوان نسل کو اس موضوع پر بات کرنے اور سیکھنے کا موقع ملے۔

بابِ ششم: بین الاقوامی سطح پر مؤثر حکمتِ عملی

عقیدۂ ختمِ نبوت کو درپیش چیلنجز صرف مقامی یا قومی سطح کے نہیں ہیں؛ بلکہ یہ ایک عالمی مسئلہ ہے؛ کیونکہ گمراہ کن نظریات انٹرنیٹ کے ذریعے پوری دنیا میں پھیل رہے ہیں۔ لہٰذا، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک مؤثر، مربوط اور جامع بین الاقوامی حکمتِ عملی وضع کرنا ناگزیر ہے۔ اگلی سطریں مسلم ممالک کے باہمی تعاون، غیر مسلم دنیا میں اسلام کے صحیح تعارف اور عالمی میڈیا میں مثبت تصویر کشی جیسے اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔

الف: مسلم ممالک کے درمیان تعاون

مسلم دنیا اگر متحد ہو جائے تو وہ اس محاذ پر ناقابلِ تسخیر قوت بن سکتی ہے۔

- **او آئی سی (OIC) اور اسلامی کانفرنس کا کردار:** اسلامی تعاون تنظیم (Organisation of Islamic Cooperation) 57 مسلم ممالک کا متحدہ پلیٹ فارم ہے اور اس مسئلے پر کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے۔

- o **متفقہ قراردادیں:** OIC کو چاہیے کہ وہ ختمِ نبوت کے تحفظ کو اپنے ایجنڈے کا مستقل حصہ بنائے اور اس کے خلاف ہونے والی کسی بھی عالمی سازش کے خلاف متفقہ قراردادیں منظور کرے۔
- o **مانیٹرنگ سیل کا قیام:** OIC کے تحت ایک "عالمی مانیٹرنگ سیل" قائم کیا جائے جو دنیا بھر میں ختمِ نبوت کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈے پر نظر رکھے اور رکن ممالک کو بروقت اس سے آگاہ کر کے جوابی حکمتِ عملی فراہم کرے۔
- o **سفارتی دباؤ:** اگر کوئی ملک یا ادارہ منظّم طریقے سے اس عقیدے کے خلاف مہم چلائے تو OIC کو اپنے سفارتی اور معاشی اثر و رسوخ کو استعمال کر کے اس کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے۔

- **علما کی بین الاقوامی کانفرنسز:** مسلم ورلڈ لیگ (رابطۃ العالم الاسلامی) اور دیگر عالمی اسلامی تنظیموں کے زیرِ اہتمام دنیا کے جید اور مستند علما کی سالانہ کانفرنسز منعقد کی جائیں۔ ان کا مقصد صرف تقاریر کرنا نہ ہو؛ بلکہ سال بھر کے لیے عملی اہداف (Actionable Goals) طے کرنا اور ان کے حصول کے لیے وسائل مختص کرنا ہو۔
- **مشترکہ علمی منصوبوں کا اجرا:** مسلم ممالک کو مل کر بڑے علمی منصوبے شروع کرنے چاہیے۔ مثال کے طور پر، "انسائیکلوپیڈیا آف خاتم النبیین" (Encyclopedia of the Finality of Prophethood) کی تیاری، جو دنیا کی دس بڑی زبانوں میں ہو اور جس میں اس عقیدے کے تمام پہلوؤں — قرآنی، حدیثی، تاریخی، عقلی اور سائنسی — کا احاطہ کیا گیا ہو۔ اسی طرح ایک عالمی معیار کی "سیرت چیئر" یا تحقیقی انسٹیٹیوٹ کا قیام عمل میں لایا جا سکتا ہے۔

ب: غیر مسلم دنیا میں تبلیغ و تعارف

بہت سے غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام صحیح شکل میں پہنچا ہی نہیں ہے۔ ان تک پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے۔

- **انٹرفیتھ ڈائیلاگ (Interfaith Dialogue) میں شرکت:** بین المذاہب مکالمے کے پلیٹ فارمز پر بھرپور شرکت کی جائے۔ اس کا مقصد اپنے عقائد پر سمجھوتہ کرنا نہیں؛ بلکہ پُرامن اور علمی ماحول میں اسلام کے موقف کو واضح کرنا ہے۔ جب ہم احترام کے ساتھ دوسروں کو

بتائیں گے کہ ہمارے لیے ختمِ نبوت کا عقیدہ کیوں اور کتنا اہم ہے، تو غلط فہمیاں دور ہوں گی اور اسے "عدمِ رواداری" سمجھنے کا تاثر زائل ہوگا۔

- **جامعات اور تحقیقی اداروں کا کردار:** مسلم اسکالرز اور دانشوروں کو مغربی یونیورسٹیوں، تھنک ٹینکس اور تحقیقی اداروں کے ساتھ علمی روابط استوار کرنے چاہییے۔ وہاں کے جرائد میں تحقیقی مقالات شائع کروائیں، کانفرنسز میں پیپرز پیش کریں اور اسلام کے تصورِ نبوت کو عالمی علمی ڈسکورس (Academic Discourse) کا حصہ بنائیں۔
- **سفارتی چینلز کا استعمال:** مختلف ممالک میں موجود مسلم سفارت خانوں کو صرف سیاسی اور معاشی امور تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ انھیں ثقافتی اور علمی سرگرمیوں کا مرکز بننا چاہیے۔ وہ اپنے ملک میں مستند اسلامی لٹریچر کی تقسیم، سیمینارز کے انعقاد اور مقامی میڈیا اور پالیسی سازوں کے ساتھ روابط قائم کر کے اسلام کا صحیح اور مثبت تعارف پیش کر سکتے ہیں۔

ج: عالمی میڈیا میں مثبت تصویر کشی

آج کے دور کی جنگ بڑی حد تک بیانیے (Narrative) کی جنگ ہے۔ ہمیں اپنا بیانیہ خود پیش کرنا ہوگا۔

- **بین الاقوامی میڈیا کے ساتھ تعاون:** CNN، BBC، Al Jazeera اور Reuters جیسے عالمی میڈیا اداروں کے ساتھ معاندانہ اور ٹکراؤ کا رویہ اپنانے کے بجائے ان کے ساتھ پیشہ ورانہ تعلقات استوار کیے جائیں۔ انھیں اس موضوع پر بات کرنے کے لیے ایسے تعلیم یافتہ، خوش گفتار اور مدلل ترجمان فراہم کیے جائیں جو انگریزی اور دیگر زبانوں پر عبور رکھتے ہوں اور اسلام کا بیانیہ بہتر طریقے سے پیش کر سکیں۔
- **ترجمے کے پروجیکٹس:** یہ سب سے اہم اور فوری کاموں میں سے ایک ہے۔ اردو اور عربی میں موجود عقیدۂ ختمِ نبوت پر اعلیٰ پائے کے علمی کام کو جنگی پیمانے پر انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی، جرمن اور دیگر علاقائی اور بڑی زبانوں میں ترجمہ کر کے آن لائن اور پرنٹ کی شکل میں مفت یا کم قیمت پر دستیاب کرایا جائے۔
- **ثقافتی تبادلے کے پروگرام:** مغربی دنیا کے صحافیوں، اساتذہ، طلبہ اور دیگر مؤثر

شخصیات کو مسلم ممالک کے دورے پر مدعو کیا جائے، جہاں وہ یہاں کے علما اور اسکالرز سے براہِ راست ملیں اور اسلامی ثقافت کو قریب سے دیکھیں۔ اس طرح کے تبادلے شکوک وشبہات کو ختم کرنے اور دیرپا مثبت تعلقات استوار کرنے میں بہت مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔

باب ہفتم: عملی منصوبوں کی تفصیل اور نفاذ

کسی بھی حکمت عملی کی کامیابی کا انحصار اس کے قابلِ عمل نفاذ (Implementation) پر ہوتا ہے۔نظریات اور منصوبوں کو جب تک ایک واضح ٹائم لائن اور ایکشن پلان میں نہ ڈھالا جائے، وہ محض خیالات ہی رہتے ہیں۔ اگلی سطروں میں پیچھے زیرِ بحث لائی گئی تمام حکمت عملیوں کو قلیل مدتی، متوسط مدتی اور طویل مدتی منصوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے؛ تاکہ ایک منظّم اور مرحلہ وار طریقے سے اہداف کا حصول ممکن ہو سکے۔

الف: قلیل مدتی منصوبے (1 سے 2 سال)

یہ وہ فوری اقدامات ہیں جن پر کم وسائل کے ساتھ اور کم وقت میں عمل درآمد شروع کیا جا سکتا ہے؛ تاکہ ایک مضبوط بنیاد فراہم ہو سکے۔

- **فوری آگاہی مہمات**

o مقصد: عوام الناس، خصوصاً نوجوانوں میں، اس عقیدے کی بنیادی اہمیت کو فوری طور پر اجاگر کرنا۔

o طریقۂ کار:

۱۔ سوشل میڈیا blitz: تمام پلیٹ فارمز (فیس بک، یوٹیوب، انسٹاگرام) پر #KhatmeNabuwwatAwareness جیسی مہم شروع کی جائے۔

۲۔ خطباتِ جمعہ: ملک بھر کے علما سے رابطہ کر کے سال کے کئی جمعوں میں ختم نبوت کے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر خطبہ دینے کی درخواست کی جائے۔

۳۔ ڈیجیٹل پوسٹرز: آسان فہم زبان میں دلائل پر مبنی ڈیجیٹل پوسٹرز اور انفوگرافکس بنا کر واٹس ایپ اور دیگر میسجنگ ایپس کے ذریعے پھیلائے جائیں۔

- **بنیادی تعلیمی مواد کی تیاری**

o مقصد: عام آدمی کے لیے ایک "اسٹارٹر کٹ" تیار کرنا۔

o طریقۂ کار:

۱۔ کتابچہ: 20-30 صفحات پر مشتمل ایک جامع مگر آسان کتابچہ "ہم ختمِ نبوت پر ایمان کیوں رکھتے ہیں؟ یا اس جیسے دوسرے عنوان" سے شائع کیا جائے۔

۲۔ اینی میٹڈ ویڈیوز: 2 سے 3 منٹ کی 5 مختصر اینی میٹڈ ویڈیوز تیار کی جائیں جو اس عقیدے کے بنیادی دلائل (مثلاً آیتِ خاتم النبیین، حدیثِ قصرِ نبوت وغیرہ) کو بصری انداز میں سمجھائیں۔

۳۔ ویب سائٹ کا بنیادی ورژن: ایک بنیادی ویب سائٹ (Basic Website) لانچ کی جائے جس پر یہ ابتدائی مواد اپلوڈ کر دیا جائے۔

- **سوشل میڈیا ٹیموں کا قیام**

o مقصد: آن لائن محاذ پر منظّم موجودگی کو یقینی بنانا۔

o طریقۂ کار: ہر بڑے شہر میں 10-15 رضا کار نوجوانوں پر مشتمل سوشل میڈیا ٹیمیں تشکیل دی جائیں۔ ان کی ایک مختصر ورکشاپ میں تربیت کی جائے کہ کس طرح مستند مواد کو پھیلانا ہے اور منفی پروپیگنڈے کا جواب دیے بغیر مثبت مواد کیسے پیش کرنا ہے۔

ب: متوسط مدتی منصوبے (3 سے 5 سال)

یہ منصوبے زیادہ ٹھوس اور دیرپا نوعیت کے ہیں، جن کے لیے زیادہ وسائل اور وقت درکار ہے۔

- تحقیقی پروجیکٹس کی تکمیل

o مقصد: اعلیٰ پائے کا علمی اور تحقیقی مواد تیار کرنا۔

o طریقۂ کار: یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کے اسکالرز کو اس موضوع پر کتابیں لکھنے اور مقالے تحریر کرنے کے لیے گرانٹس اور فیلوشپس دی جائیں۔ ان پروجیکٹس کی تکمیل کے لیے 3 سے 4 سال کا ہدف مقرر کیا جائے۔

- **تعلیمی اداروں میں خصوصی کورسز کا اجرا**
  - o مقصد: تعلیمی نظام میں اس موضوع کو باقاعدہ جگہ دینا۔
  - o طریقۂ کار:

۱۔ نصاب کی تیاری: یونیورسٹی کی سطح کے لیے "مطالعۂ ختمِ نبوت" پر ایک سمسٹر کا اختیاری (Optional) کورس ڈیزائن کیا جائے۔

۲۔ اساتذہ کی تربیت: اس کورس کو پڑھانے کے لیے اساتذہ کے لیے خصوصی تربیتی پروگرامز (Training Programs) کا انعقاد کیا جائے۔

۳۔ پائلٹ پروجیکٹ: ملک کی بعض بڑی یونیورسٹیوں میں اس کورس کا بطور پائلٹ پروجیکٹ آغاز کیا جائے۔

- **علمی کتابوں کی اشاعت اور تراجم**
  - o مقصد: تحقیقی مواد کو عوام اور عالمی برادری تک پہنچانا۔
  - o طریقۂ کار: قلیل مدتی منصوبوں میں مکمل ہونے والی تحقیقی کتب کو شائع کیا جائے اور ان میں سے سب سے اہم چند کتب کا انگریزی، عربی اور دنیا کی دوسری بڑی زبانوں میں ترجمہ کر کے آن لائن دستیاب کرایا جائے۔

ج: طویل مدتی منصوبے (5 سے 10 سال)

یہ منصوبے معاشرے میں بنیادی تبدیلی لانے پر مرکوز ہیں، جن کے اثرات دہائیوں تک اور نسلوں تک محسوس کیے جائیں گے۔

- **نسل کی تربیت اور تیاری**
  - o مقصد: ایک ایسی نسل تیار کرنا جس کے دل و دماغ میں یہ عقیدہ راسخ ہو۔
  - o طریقۂ کار: متوسط مدتی منصوبے میں شروع کیے گئے تعلیمی کورسز کے نتائج کا جائزہ لے کر اسے اسکول اور کالج کی سطح پر بھی عمر کے مطابق ڈھال کر نصاب کا لازمی حصہ بنایا جائے۔ یہ ایک نسلی سرمایہ کاری (Generational Investment) ہے۔
- **عالمی سطح پر شعور بیداری**

o مقصد: عالمی علمی اور فکری حلقوں میں اسلام کا موقف مستحکم کرنا۔

o طریقۂ کار:

۱۔ عالمی تحقیقی مرکز: "بین الاقوامی مرکز برائے مطالعۂ ختمِ نبوت" کے نام سے ایک خودمختار تحقیقی ادارے کا قیام۔

۲۔ عالمی زبانوں میں مواد: کم از کم 10 عالمی زبانوں میں بنیادی لٹریچر، ویڈیوز اور ویب سائٹس کی دستیابی۔

۳۔ عالمی مکالمہ: مغربی جامعات کے ساتھ مل کر مشترکہ کانفرنسز اور مکالموں کا انعقاد۔

- **مکمل نظامِ تعلیم میں موضوع کا اضافہ**

o مقصد: اس عقیدے کو تعلیم کے ہر شعبے سے جوڑنا۔

o طریقۂ کار: عقیدۂ ختمِ نبوت کو صرف اسلامیات تک محدود نہ رکھا جائے؛ بلکہ تاریخ کی کتب میں جھوٹے مدعیانِ نبوت کے خلاف اسلامی ریاستوں کے اقدامات، اردو ادب میں نعتیہ شاعری کے ذریعے، اور سماجی علوم میں اس عقیدے کے معاشرتی اثرات (مثلاً امت کا اتحاد) کو شامل کر کے ایک جامع اور مربوط تعلیمی تجربہ فراہم کیا جائے۔

خاتمہ

مستقبل کا لائحہ عمل

اس مقالے میں ہم نے "دورِ حاضر میں تحفظِ ختمِ نبوت" کے موضوع کا ہر پہلو سے جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے اس عقیدے کی قرآنی اور حدیثی بنیادوں سے آغاز کیا۔ تاریخ میں اس کے تحفظ کی کوششوں کا جائزہ لیا، اور پھر جدید دور میں درپیش فکری، ابلاغی اور تعلیمی چیلنجز کا گہرائی سے تجزیہ کیا۔ اس تجزیے کی روشنی میں ہم نے علمی، تعلیمی، تکنیکی، ادارہ جاتی اور بین الاقوامی سطح پر ایک جامع اور کثیر جہتی حکمتِ عملی اور عملی منصوبوں کا ایک خاکہ پیش کیا۔

- **مجموعی تجزیہ اور نتیجہ:** ہمارا تجزیہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ عقیدۂ ختمِ نبوت صرف ایک کلامی بحث نہیں؛ بلکہ یہ دینِ اسلام کی کاملیت، آفاقیت اور اس کے دائمی تحفظ کی ضمانت ہے۔ جدیدیت

کے نام پر اٹھنے والے فکری شبہات اور ٹیکنالوجی کے ذریعے پھیلایا جانے والا گمراہ کن پروپیگنڈا اس عقیدے کے لیے اصل خطرہ ہیں۔ ان کا مقابلہ صرف جذباتی نعروں سے نہیں؛ بلکہ ٹھوس علمی تحقیق، جدید ٹیکنالوجی کے مثبت استعمال اور ایک مربوط اور منظّم حکمتِ عملی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

- **عملی اقدامات کا خلاصہ:** اس تحقیق کا عملی خلاصہ یہ ہے کہ تحفظِ ختمِ نبوت کا کام اب روایتی طریقوں تک محدود نہیں رہ سکتا۔ اسے ایک ہمہ جہت تحریک کی شکل اختیار کرنی ہوگی جس کے اہم ستون یہ ہیں: اعلیٰ پائے کی علمی تحقیق، نظامِ تعلیم میں بنیادی اصلاحات، جدید ٹیکنالوجی کا پیشہ ورانہ استعمال، تمام اداروں (مذہبی، حکومتی، سماجی) کی فعال شرکت، اور مؤثر عالمی سفارت کاری۔ ان تمام محاذوں پر بیک وقت کام کرنا ہوگا۔
- **امت کی اجتماعی ذمہ داری:** یہ ذمہ داری کسی ایک فرد، جماعت یا ادارے کی نہیں ہے۔ یہ پوری امتِ مسلمہ کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ منبر ومحراب سے لے کر پارلیمنٹ تک، گھر کی دہلیز سے لے کر یونیورسٹی کے کیمپس تک، اور مقامی کمیونٹی سے لے کر بین الاقوامی فورمز تک، ہر مسلمان کو اپنی حیثیت اور دائرہ کار میں اس ذمہ داری کو ادا کرنا ہے۔ اگر ہم میں سے ہر ایک اپنی ذمہ داری کو پہچان لے تو کوئی بھی فتنہ اس امت کے ایمان پر حملہ آور نہیں ہوسکتا۔

☆☆☆

حواشی

۱۔ بخاری، کتاب فضائل الصحابۃ، حدیث:3706؛ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، حدیث:2404
۲۔ مسلم، حدیث:2286، صحیح البخاری، کتاب المناقب، حدیث:3535
۳۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، جلد6، واقعاتِ جنگِ یمامہ
۴۔ آئینِ پاکستان، دوسری ترمیم، 1974

☆☆☆

محاکمہ وجائزہ

حضرت ابو ہریرہؓ پر اعتراضات-ایک علمی محاکمہ

(مصری مصنف ابوریہ کے دعووں کا جائزہ)

محمد فرید حبیب ندوی

گزشتہ سے پیوستہ شمارے میں ہم حضرت ابو ہریرہؓ کی شخصیت کے حوالے سے، عربی زبان وادب کے مشہور ادیب ڈاکٹر احمد امین کے اعتراضات کا جائزہ پیش کر چکے ہیں۔اب اس شمارے میں مصر کے معروف مصنف ابوریہ کے افکار واعتراضات کا علمی محاکمہ پیش ہے۔ یہ بحث بھی ڈاکٹر مصطفیٰ سباعیؒ کی معروفِ زمانہ کتاب ''السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی'' کوسامنے رکھ کر تیار کی گئی ہے۔

جناب ابوریّہ صاحب نے اپنی کتاب ''أضواء علی السنۃ المحمدیۃ'' میں حضرت ابو ہریرہؓ کی شان میں طنز وتعریض کے بڑے نشتر چلائے ہیں اور ان کی شان میں بڑی گستاخیاں کی ہیں۔ذیل میں ہم ان کے اعتراضات اور جوابات عرض کرتے ہیں:

۱۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے نام میں اختلاف

جناب ابوریہ لکھتے ہیں: ''جتنا اختلاف حضرت ابو ہریرہؓ کے نام میں ہے، اتنا کسی صحابی کے نام میں نہیں۔ان کے نام کے سلسلے میں تقریباً تیس اور بعض کے نزدیک ۴۴/اقوال ہیں''(۱)۔

یہ کہہ کر گویا وہ حضرت ابو ہریرہؓ کی عظمت کو کم کرنا چاہتے ہیں؛ لیکن:

- کسی کے نام میں اختلاف ہونے سے اس کی عظمت میں فرق نہیں آجاتا۔کیا

انھیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عظمت کا دار و مدار نام ولقب پر نہیں رکھا۔

- اور بھی بہت سے صحابۂ کرام کے ناموں میں اختلاف ہے؛ مگر اس سے ان کی شان میں کوئی فرق نہیں آیا۔
- حضرت ابو ہریرہؓ کے نام میں اختلاف کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ جب سے اسلام لائے، اپنے اسی نام سے مشہور ہو گئے؛ اس لیے ان کے اصلی نام پر پردہ پڑ گیا۔ آج کتنے لوگ ہیں، جو حضرت ابو بکرؓ کے اصلی نام سے واقف ہوں گے۔ بھلا کیا اس سے ان کی عظمت میں کوئی کمی آ گئی۔
- اس سلسلے میں جو ۳۰/۴۰/اقوال بیان کیے جاتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ذرا سی تحریف کی وجہ سے ایک ایک نام کو کئی شمار کر لیا گیا ہے۔ جیسے: سعد اور سعید ایک ہی نام تھے؛ مگر ''ی'' کی کمی یا بیشی سے دو ہو گئے۔ اسی طرح دیگر ناموں کا حال ہے۔ ورنہ ابن حجرؒ کے بقول: ''وہ دس سے زیادہ نہیں۔ اور اگر مزید تحقیق سے کام لیا جائے تو صرف تین نام باقی رہ جاتے ہیں: عمر، عبداللہ اور عبدالرحمٰن'' (۲)۔

۲۔ اسلام سے ماقبل کے حالات اور نسب کی تفصیلات کا علم نہ ہونا

جناب ابو ریہ کہتے ہیں '': حضرت ابو ہریرہؓ کے بچپن کی کچھ تفصیلات نہیں ملتیں اور ان کے خاندان کے بارے میں بھی بس اتنا معلوم ہے کہ وہ قبیلۂ دوس کی ایک شاخ ''ازد'' سے تعلق رکھتے تھے'' (۳)۔

مگر یہ بتایا جائے کہ:

- کیا یہ کافی نہیں کہ وہ قبیلۂ دوس سے تعلق رکھتے تھے، جس کا عربی قبائل میں ایک ممتاز اور نمایاں مقام تھا۔
- دورِ جاہلیت میں عرب گم نامی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ باہر کی دنیا سے ان کے روابط بہت کم تھے؛ اس لیے اس دور کی معلومات بہت کم ملتی ہیں۔ یہ سلسلہ تو اسلام کے بعد شروع ہوا۔ اور اس سلسلے میں حضرت ابو ہریرہؓ کا جو حال ہے، وہی دیگر صحابہ کا بھی ہے۔ حجۃ الوداع میں سوا لاکھ صحابہ موجود تھے، کیا ابو ریہ ان میں سے چند کے سوا تمام صحابہ کے تفصیلی

حالات بتا سکتے ہیں؟

- اور جب اس سے دیگر صحابہ کی شان میں کچھ کمی نہیں آئی، تو ابو ہریرہؓ کی شان میں کیوں کر آسکتی ہے؟

پھر یہ کس آیت سے ثابت ہے کہ جس کی قبل از اسلام تاریخ معلوم نہ ہو، اسے بے وقعت سمجھنا چاہیے؟

۳۔ ناخواندگی

ابوریہ کہتے ہیں: ''حضرت ابو ہریرہ ناخواندہ تھے، لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے'' (۴)۔

کسی صحابی کا امی ہونا کسی بھی دور میں قابل طعن نہیں رہا، یہ ان کی نئی اپج ہے۔ پھر ذرا بتایئے کہ سوا لاکھ صحابہؓ کرام میں کتنے لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے؟ چند کے سوا سب ہی تو امی تھے۔ پھر حضرت ابو ہریرہؓ کی تخصیص چہ معنی دارد؟

۴۔ فقر و فاقہ

ابوریہ نے اپنی کتاب میں کئی جگہ حضرت ابو ہریرہؓ کا تذکرہ بڑی حقارت سے کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ '' وہ تہی دست تھے اور رسول اللہ ﷺ کے درِ دولت پر اس لیے پڑے رہتے تھے؛ تاکہ دو وقت کی روٹی میسر آسکے۔ قبیلے میں ان کی کوئی عزت نہ تھی'' (۵)۔

فقرا کو حقیر سمجھنا اور ان کی بے توقیری کرنا تو کفار و معاندین کا رویہ رہا ہے۔ بے ایمان و بے توفیق لوگ ہی ہمیشہ فقرائے مؤمنین کا مذاق اڑاتے آئے ہیں (۶)۔ اسلام میں تو یہ چیز کبھی بھی قابل حقارت نہیں رہی؛ بلکہ انبیا پر ایمان لانے والے اور خاص کر حضور ﷺ پر اول اول ایمان لانے والے فقرا ہی تھے۔ اس لیے ابوریہ کی یہ روش اور ذہنیت کفار کی روش سے میل کھاتی ہے۔ ورنہ اسلامی تاریخ میں ان فقرا کے جو کارنامے ہیں، دنیا ان سے واقف ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر حضور اکرم ﷺ نے کعبے کی چھت سے اذان دینے کے لیے بڑے بڑوں کی موجودگی میں جس کا انتخاب کیا، وہ حضرت بلالؓ تھے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ، حضرت بلالؓ و صہیبؓ وغیرہم کو بہت سے بڑے بڑے صحابہ پر فضیلت دیتے تھے۔ اس لیے اس اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں۔

۵۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا اسلام

محترم ابوریہ صاحب نے حضرت ابو ہریرہؓ پر یہ الزام لگایا ہے کہ ''وہ صادق الاسلام نہ تھے اور انھوں نے حضورﷺ کی صحبت اس لیے اختیار کی تھی؛ تاکہ وہاں اچھی طرح شکم سیری کے مواقع مل سکیں'' (۷)۔

پہلی بات یہ عرض ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے اسلام لانے کے بارے میں دو روایات ملتی ہیں:

ایک روایت (۸) یہ ہے کہ وہ ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے موقع پر اسلام لائے۔ دوسری روایت (۹) یہ ہے کہ وہ اسلام تو کئی سال پہلے لا چکے تھے؛ البتہ انھوں نے (خیبر کی طرف) ہجرت ۷ھ میں کی۔

ہمارے نزدیک دوسری بات زیادہ راجح ہے۔ اس کی دو دلیلیں ہیں:

۱۔ ابن حجرؒ نے الاصابہ (۱۰) میں حضرت طفیل بن عمرو دوسی کے اسلام لانے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اس میں ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی قوم ''دوس'' (جس کے ابو ہریرہؓ بھی ایک فرد تھے) کی طرف واپس ہوئے اور انھیں اسلام کی دعوت دی۔ ان کی دعوت پر صرف ان کی والدہ اور حضرت ابو ہریرہؓ نے اسلام قبول کیا۔ یہ روایت صراحت کرتی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ ہجرت خیبر سے پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے۔

۲۔ بخاری (۱۱) نے ذکر کیا ہے کہ خیبر کی تقسیمِ غنیمت کے موقع پر حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابان بن سعد کے درمیان تکرار ہوئی۔ حضرت ابان نے غنیمت میں سے اپنا حصہ مانگا تو حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ اے اللہ کے رسولﷺ! ان کو حصہ نہ دیجیے؛ کیوں کہ انھوں نے غزوۂ احد میں نعمان بن مالک کو (جو ابن قوقل کے نام سے مشہور تھے) قتل کیا تھا۔ (غزوۂ احد تک ابان نے اسلام قبول نہ کیا تھا)۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ ہجرتِ خیبر سے بہت پہلے مسلمان ہو چکے تھے اور کئی ایک غزوات میں شریک ہو چکے تھے؛ اسی لیے تو انھیں علم تھا کہ ابان بن سعد نے غزوۂ احد میں ابن قوقل کو قتل کیا تھا۔ ابن حجر (۱۲) نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے کہ وہ ۷ھ سے

بہت پہلے اسلام قبول کر چکے تھے۔

اسلام لانے کے بعد وہ پوری طرح حضور اکرم ﷺ کے دامنِ فیض سے وابستہ ہوگئے۔ اب بس ان کی یہی خواہش رہ گئی کہ زیادہ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ سے استفادہ کرسکیں، چنانچہ وہ صفۂ نبوی میں داخل ہوگئے۔ وہ اس طرح صحبت نبوی میں رہنے لگے کہ سفر وحضر کسی بھی موقع پر آپ سے الگ نہ ہوتے۔ تاوفات رسول وہ اسی طرح رہے۔

ان کے سفرِ ہجرت (۱۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی خوشی خوشی مدینہ آئے تھے اور پھر وہاں سے خیبر پہنچے تھے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ راستے میں یہ شعر گنگناتے رہے تھے:

یا لیلة من طولها وعنائها　　　على أنها من دارة الكفر نجّت

ہائے کتنی طویل اور تکلیف دہ ہے یہ رات!　　　مگر اس نے مجھے دارِ کفر سے نجات دی ہے۔

اسی طرح ذکر کیا گیا ہے کہ راستے میں ان کا غلام بھاگ گیا۔ جب وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پہنچے، تو وہ غلام بھی سامنے آ گیا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ابو ہریرہ! یہ رہا تمھارا غلام''۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے (خوشی میں) عرض کیا: ''یہ اللہ کے لیے آزاد ہے''۔

ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سچے عاشقِ رسول اور پیکرِ صدق واخلاص تھے۔ انھیں رسول اللہ ﷺ کی ملاقات سے اتنی خوشی ہوئی کہ اپنا غلام ہی آزاد کردیا۔

۶۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور صحبتِ رسول ﷺ

ابو ریہ (۱۴) نے حضرت ابو ہریرہؓ کی فاقہ کشی کی داستان بڑے مزے لے لے کر بیان کی ہے اور آپ پر یہ الزام لگایا ہے کہ انھوں نے حضور اکرم ﷺ کی صحبت ورفاقت اسی لیے اختیار کی تھی؛ تاکہ چین سے کھا پی سکیں اور پیٹ بھر کھانے کا نظم ہو سکے۔

اس سلسلے میں چند گزارشات ہیں:

۱۔ فقر و فاقہ اور افلاس، شرفا کے یہاں کوئی عیب کی بات نہیں۔ ہاں ایسے ادنی سوچ والوں کے نزدیک اس میں عار ہوسکتا ہے، جو صرف مال وجاہ کو ہی عزت وعظمت کا واحد معیار سمجھتے ہیں۔

۲۔ ابوریہ کا یہ کہنا کہ ''ابو ہریرہؓ نے آپ ﷺ کی رفاقت شکم سیری کے لیے اختیار کی تھی'' بے حیائی اور بغض ونفرت کی علامت ہے۔

کیا حضرت ابو ہریرہؓ کے قبیلے میں سامانِ خورونوش کی کمی تھی کہ وہ کھانے پینے کے لیے مدینے آتے؟ صرف کھانے پینے کے مقصد سے تو گداگر بھی سکونت کے لیے اپنے وطن کو چھوڑ کر دور دراز جگہ نہیں جاتے، وہ بھی مال جمع کرنے جاتے ہیں۔اور یہ بات خود ابوریہ کو بھی تسلیم ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے مال جمع نہیں کیا۔تو کیا ان کی نگاہ میں حضرت ابو ہریرہؓ گدا گروں سے بھی کم درجہ ہو گئے؟

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کی صحبت ورفاقت اختیار کرنے کے سلسلے میں ابوریہ نے جو روایت پیش کی ہے، وہ اس طرح نہیں، جیسے انھوں نے بیان کی؛ بلکہ صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:''وكنت ألزم رسول الله ﷺ على ملء بطني''(۱۵)۔اور مسلم کے الفاظ یہ ہیں:''كنت رجلاً مسكيناً أخدم رسول الله ﷺ علي ملء بطني''(۱۶)۔

اس میں محض صحبت اختیار کرنے کا ذکر نہیں؛ بلکہ آپ کے ساتھ مستقل رہنے اور خدمت کرنے کا ذکر ہے۔اور یہ بات بھی حضرت ابو ہریرہؓ نے اس پس منظر میں کہی ہے کہ اوروں کے مقابلے میں ابو ہریرہؓ کے کثیر الروایت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دیگر لوگ کام کاج میں مشغول رہتے تھے اور میں قوتِ لایموت پر بس آپ کے در پر پڑا رہتا تھا۔

۴۔ ابوریہ نے ''على ملء بطني'' کے مفہوم میں بھی ردوبدل کرنے کوشش کی اور یہ بیان کیا ہے کہ ابن ہشام کہتے ہیں: "على" تعلیل کے لیے آتا ہے۔اس معنی کے حساب سے حدیث کا مطلب نکلے گا کہ میں پیٹ بھرنے کے لیے پڑا رہتا تھا۔

یہ محض افترا پردازی ہے؛اس لیے کہ ابن ہشام نے تو یہ ذکر کیا ہے کہ "على" ۹؍معانی کے لیے آتا ہے، جن میں ایک تعلیل بھی ہے۔اب یہ بتایئے کہ ابوریہ نے ۹؍میں سے محض تعلیل کے لیے ہی اسے کیوں متعین سمجھا؟ جب کہ اس میں دوسرے معانی کا بھی احتمال ہے۔

ابوریہ کے برعکس تمام ائمہ ومحدثین نے اس حدیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہتا تھا اس روزی روٹی پر جس سے پیٹ بھر جاتا، یعنی قوتِ لایموت پر۔ علامہ نووی (۱۷)، حافظ ابن حجر (۱۸) اور علامہ عینی (۱۹)؛ سب نے یہی مفہوم بیان کیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ابوریہ نے اپنے بغض وکینے کی وجہ سے حضرت ابو ہریرہؓ کے اسلام اور اللہ ورسول سے ان کی محبت میں شک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؛ مگر اس میں وہ بری طرح ناکام ہوا؛ کیوں کہ یہ واقعہ اور ان کا رسول اللہ ﷺ کی صحبت اختیار کرنا؛ ان کی محبت کے سچا ہونے کی دلیل ہے، جس میں حب دنیا، مال کی خواہش اور جاہ پسندی کا کوئی شائبہ تک نہیں؛ اس لیے کہ اگر انھیں دنیا یا مال کی محبت ہوتی، تو وہ مدینے آکر بھی تجارت وزراعت کرتے اور مال کماتے؛ لیکن انھوں نے ایسا کچھ بھی نہ کیا؛ بلکہ انھوں نے علم حدیث کی طلب کے لیے ان تمام چیزوں کو ٹھکرا دیا۔ اسی طرح اگر انھیں جاہ کی طلب ہوتی، تو وہ صفہ کے مکین نہ بنتے۔ ان کا بھوک کی سختی کو برداشت کرنا اور صفۂ نبوی پر پڑے رہنا جاہ پسندی کے ہر شائبے کو دور کر دیتا ہے۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں انھیں بحرین کا گورنر بنایا تھا (۲۰)۔ ان کے پاس کچھ مال آیا، تو حضرت عمرؓ نے ان سے محاسبہ کیا۔ حساب تو بالکل ٹھیک نکلا؛ مگر اس کے بعد آپ نے دوبارہ یہ منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر وہ جاہ پسند ہوتے تو اتنا عظیم منصب کیوں کر ٹھکرا دیتے!!

۷۔ حضرت ابو ہریرہؓ بسیار خور تھے

ابوریہ نے لکھا ہے کہ:

(الف) حضرت ابو ہریرہؓ بسیار خور تھے۔

(ب) روزانہ آں حضرت ﷺ یا کسی صحابی کے گھر جا کر کھایا کرتے۔

(ج) حتی کہ بعض لوگ ان سے نفرت کرنے لگے تھے'' (۲۱)۔

اس سلسلے میں چند باتیں قابل ذکر ہیں:

(الف) یہ بھی ایک تاریخی جھوٹ اور حقیقت کو بگاڑ کر پیش کرنے کی گھناؤنی مثال ہے:

اولاً تو حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں بسیار خوری کی بات کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں۔اور اگر اسے ثابت مان بھی لیا جائے تو اس سے حضرت ابو ہریرہؓ کی صداقت وعدالت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ دنیا کے کسی بھی مذہب میں زیادہ کھانے سے عدالت مجروح نہیں ہوتی۔

(ب) اور جہاں تک حضرت ابو ہریرہؓ کے صحابہ کرام کے گھروں پر جانے کی بات ہے تو ابوریہ نے اسے اس طرح پیش کیا ہے جیسے نعوذ باللہ وہ کوئی گداگر تھے، جو ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے۔جس کا جی چاہتا، انھیں دے دیتا اور جو چاہتا انھیں دھتکار دیتا، حالاں کہ یہ واقعے کی نہایت غلط تصویر کشی ہے۔بات جو کچھ ہے وہ بس اتنی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ صفہ میں مقیم تھے۔اور اصحاب صفہ، حضور اکرم ﷺ کے مہمان ہوتے تھے، چنانچہ کوئی صحابی اگر وہاں کچھ لاکر دے دیتا، تو آپ ﷺ کے ساتھ اسے کھانے میں دیگر اصحاب صفہ کی طرح حضرت ابو ہریرہؓ بھی شریک ہوتے۔اور اگر کوئی آپ ﷺ کو دعوت دیتا، تو آپ کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ (اور بعض دیگر اصحاب) بھی چلے جاتے۔

ابوریہ نے اپنی بات کو مؤکد کرنے کے لیے یہ روایت بھی پیش کی ہے کہ ''حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روزانہ آمد ورفت کی وجہ سے ان سے فرمایا تھا: ''زرغبــــاً تــزدد حبــاً'' کہ تم لوگوں کے گھروں پر روزانہ نہ جایا کرو۔حالاں کہ یہ استدلال بالکل غلط ہے؛اس لیے کہ اس حدیث کا پس منظر-جیسا کہ خود ابوریہ نے بھی لکھا ہے- یہ ہے کہ ایک دن آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: تم کل کہاں تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں اپنے گھر والوں سے ملاقات کے لیے گیا تھا، تو آپ نے فرمایا: ''ناغہ کرکے میری زیارت کیا کرو'' (۲۲)۔

ذرا غور کیجیے کہ ابوریہ نے اس حدیث سے جو استدلال کیا ہے اور اس کا جو پس منظر بیان کیا ہے، دونوں میں کتنا واضح تضاد ہے۔پھر یہ بھی ہے کہ اس حدیث کی صحت مشکوک ہے۔حافظ سخاوی نے محدث عقیلی کے واسطے سے لکھا ہے کہ یہ ضعیف ہے (۲۳)۔ابن حبان نے اسے عبید بن عمیر پر موقوف بتایا ہے۔سخاوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ حدیث مختلف صحابہ سے مروی ہے اور ابن عدی نے یہ حدیث اپنی کتاب میں چودہ مقامات پر نقل کی ہے؛ مگر ان

میں سے ایک بھی علت سے خالی نہیں، تاہم کثرت طرق سے تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔

بہر حال اگر اسے صحیح مان بھی لیا جائے، تو بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے یہ الفاظ خاص حضرت ابو ہریرہؓ سے کہے تھے۔ دس صحابہ نے اسے روایت کیا ہے۔ اب ابوریہ بتائیں کہ کیا وہ سب کو گداگر کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔

(ج) رہا ابوریہ کا یہ کہنا کہ بعض صحابۂ کرام حضرت ابو ہریرہؓ سے نفرت کرنے لگے تھے، تو ہم اسے چیلنج کرتے ہیں کہ وہ کسی ایک بھی صحیح روایت سے یہ ثابت کر کے دکھائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام مسلمان حضرت ابو ہریرہؓ سے محبت اور احترام کا معاملہ کرتے تھے۔

ابوریہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''حضرت ابو ہریرہؓ کو قرآن کی کوئی آیت یاد ہوتی اور وہ دانستہ کسی صحابی سے پوچھتے؛ تاکہ وہ ان کی طرف متوجہ ہو اور انھیں کھانا کھلانے کے لیے اپنے ساتھ لے جائے۔ وہ حضرت جعفرؓ کے ساتھ ایسا ہی کرتے تھے، اور اسی وجہ سے وہ حضرت جعفرؓ کو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ، علیؓ و عثمانؓ اور دیگر کبار صحابہ پر فضیلت دیتے تھے'' (۲۴)۔

اس الزام میں ابوریہ نے کذب و افترا اور تضلیل سے کام لیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے الفاظ یہ ہیں ''إني لأستقرئ الرجل''۔ حضرت ابو ہریرہؓ سامنے والے سے میزبانی طلب کیا کرتے، مگر سامنے والا اس سے یہ سمجھتا کہ وہ آیت کی قراءت دریافت کر رہے ہیں، جیسا کہ ایک مرتبہ انھوں نے حضرت عمرؓ سے یہی بات کہی؛ تاکہ وہ انھیں کھانا کھلائیں؛ مگر حضرت عمرؓ اس کا یہی مفہوم سمجھے اور انھیں قرآن سنانا شروع کر دیا۔ ابو ہریرہؓ نے یہ سن کر کہا کہ میرا مقصد تو کھانا طلب کرنا تھا (۲۵)۔

جہاں تک حضرت جعفرؓ کی تعریف کی بات ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو (جن میں حضرت ابو ہریرہؓ بھی ہوتے) اپنے گھر لے جاتے اور کھانا کھلاتے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرمایا کرتے تھے کہ جعفرؓ مساکین کے حق میں سب سے بہتر ہیں۔ اور خود رسول اللہ ﷺ نے انھیں ابوالمساکین کا لقب دیا تھا (۲۶)۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے اگر تعریف کر دی تو کیا حرج؟ لیکن ایسا بالکل نہیں کہ وہ حضرت جعفرؓ کو تمام صحابہ سے افضل سمجھتے ہوں۔ وہ مسکینوں کے خیال رکھنے کے اعتبار سے انھیں افضل قرار دیتے تھے، نہ کہ عمومی اعتبار

سے، جیسا کہ ابن حجر نے فتح الباری میں صراحت کی ہے(۲۷)۔

۸۔ حضرت ابوہریرہ کھانوں کے شوقین تھے

ابوریہ نے ثعالبی (۲۸)اور ہمدانی (۲۹) کے حوالے سے لکھا ہے کہ'' ابوہریرہؓ مضیرے کو بہت پسند کرتے تھے اورانھیں ''شیخ المضیر ۃ'' کہاجاتا تھا''(۳۰)۔(مضیرہ کھانے کی ایک ڈش کا نام ہے)۔

بتایا جائے کہ کسی خاص قسم کے کھانے کو پسند کرنا کون سی بری بات ہے؟ خود آپ ﷺ کدو، پنڈلی کے گوشت اور ثرید کو پسند فرماتے تھے۔

جناب ابوریہ نے اس ضمن میں ثعالبی (۳۱) کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ لذیذ کھانوں کے لیے حضرت معاویہؓ کے کیمپ میں جاتے اور نماز حضرت علیؓ کی پیچھے پڑھتے۔

یہ روایت بالکل غلط ہے، جو یا تو شیعہ کی کتب میں ملتی ہے یا ادب عربی کی کتابوں میں، جن میں صحیح وغلط ہر قسم کی روایات ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے ان مجادلات میں حصہ نہیں لیا تھا؛ بلکہ وہ سب سے کنارہ کش رہے تھے۔

اسی ضمن میں ابوریہ نے ''کتاب الحلیہ'' سے حضرت ابوہریرہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے: ''میرے پیٹ کو خدا غارت کرے، جب میں اسے سیر کرتا ہوں، تو مجھے تنگ کرتا ہے اور اگر بھوکا رکھتا ہوں، تو مجھے برا کہتا ہے۔(۳۲)۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں : کمزور کردیتا ہے''(۳۳)۔

اولاً تو اس کتاب میں صحیح روایات کا التزام نہیں ہے، چنانچہ یہ قول بھی ضعیف ہے۔

ثانیاً یہ کوئی غلط بات نہیں۔ یہ بات تو ہر شکم پر صادق آتی ہے۔ یہ ہر پیٹ کی خاصیت ہے کہ شکم سیر ہونے پر مختلف چیزوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور بھوک کی وجہ سے کمزوری پیدا ہوتی ہے۔

اسی ضمن میں ابوریہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ثعالبی (۳۴) نے حضرت ابوہریرہؓ کا قول نقل کیا ہے ''میں نے روٹی کی خوشبو سے بہتر کوئی خوشبو نہیں سونگھی اور کھجوروں پر لگائے

گئے مکھن سے بہتر کوئی سوار نہیں دیکھا''۔

بالفرض اگر یہ بات صحیح بھی مان لی جائے، تو سوال یہ ہے کہ اس میں جرح والی کون سی بات ہے؟ یہ تو حضرت ابو ہریرہؓ کی خوش مزاجی اور عمدہ ذوق کی دلیل ہے۔

۹۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی ظرافت ومزاح پسندی

ابوریہ نے دعوی کیا ہے کہ مؤرخین کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ تمسخر ومذاق کے عادی اور کثیر الکلام اور فضول گو تھے(۳۵)۔

یہ دعوی کہ حضرت ابو ہریرہ کی بیہودہ گوئی پر مؤرخین کا اجماع ہے، افترا پردازی کے سوا کچھ نہیں۔ ابوریہ اس سلسلے میں کوئی ایک روایت بھی پیش نہیں کرسکتا۔

رہا ابوریہ کا یہ کہنا کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو یاوہ گو کہا تھا، تو اس پر ہم ڈاکٹر احمد امین کی بحث میں تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں، جس کا ماحصل یہ ہے کہ ان کے بارے میں حضرت عائشہؓ نے کوئی بات نہ کہی تھی؛ بلکہ آپ پر تنقید کرنے والا قین اشجعی نام کا ایک شخص تھا، مگر اس نے بھی بےہودہ گو نہیں کہا تھا۔

اور اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ واقعۃً حضرت عائشہؓ نے ایسا کہا تھا، تو یہ فردِ واحد کی بات ہوگی۔ ابوریہ نے جو مؤرخین کے اجماع کا دعوی کیا ہے، اس کی کیا حقیقت ہے؟ کیا حضرت عائشہؓ کی ذات میں سارے مؤرخین جمع ہوگئے ہیں؟

ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ ظریف اور مزاح پسند تھے؛ مگر یہ بتایا جائے کہ ظرافت اور مزاح عیب ہے یا اسلام میں محبوب وپسندیدہ؟ خود رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام سے مزاح فرماتے تھے، اور صحابہ ایک دوسرے سے مذاق کرتے تھے۔ اس میں خرابی کیا ہے؟

اب ہم ابوریہ کی علمی خیانت دکھانا چاہتے ہیں، انھوں نے یہ تو بیان کردیا کہ ابو ہریرہؓ کے مزاح پر مؤرخین کا اجماع ہے، اور یقیناً ایسا ہی ہے؛ مگر مؤرخین کا اس بات پر بھی تو اجماع ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ باوجود اپنی زندہ دلی اور ظرافت کے، صادق القول، حافظ حدیث اور عابد وزاہد تھے(۳۶)۔ ابوریہ نے ان کے اس اجماع سے کیوں اغماض برتا؟

اسی ضمن میں ابوریہ نے ''الحلیہ'' (۳۷) کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ'' حضرت ابوہریرہؓ سفر میں تھے۔ ان کے رفقا نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا اور کھانے کے لیے دسترخوان بچھایا۔ حضرت ابوہریرہؓ نماز میں مشغول تھے۔ انھیں بلایا گیا تو انھوں نے کہا کہ میں روزے سے ہوں۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر آئے اور کھانا کھانے لگے۔ لوگوں نے قاصد کو گھور کر دیکھا تو اس نے کہا: بخدا! ابوہریرہؓ نے کہا تھا کہ وہ روزے سے ہیں۔ یہ سن کر حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا: ''یہ سچ کہتا ہے۔ میں نے نبی ﷺ سے سنا ہے کہ جو شخص رمضان کے ساتھ ہر ماہ تین روزے رکھ لے تو یہ ہمیشہ روزہ رکھنے کی طرح ہے۔ میں نے اس ماہ تین روزے رکھ لیے ہیں۔ اس لیے میں حقیقۃً تو روزے سے نہیں؛ لیکن ثواب کے اعتبار سے روزے سے ہوں''۔

ابوریہ نے اس واقعے سے آپ پر عیب جوئی کی کوشش کی ہے، حالاں کہ یہ ایک مزاح تھا، جو حضرت ابوہریرہؓ نے اپنے رفقا کے ساتھ کیا، اس سے ان کی ثقاہت کیسے ساقط ہوسکتی ہے؟ امام احمد نے مسند میں ذکر کیا ہے کہ اسی طرح کا واقعہ حضرت ابوذر کا بھی ہے۔ کہیں ابوریہ ان کو بھی ساقط الاعتبار نہ قرار دے دے۔

۱۰۔ صحابۂ کرام حضرت ابوہریرہؓ کا مذاق اڑاتے تھے

ابوریہ (۳۸) نے دعوی کیا ہے کہ لوگ حضرت ابوہریرہؓ کی کثرتِ روایت اور ان کی مرویات کے انوکھے پن کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ چنانچہ ابورافع کا بیان ہے کہ قریش کا ایک آدمی حضرت ابوہریرہؓ کے پاس آیا، اس نے ایک شاندار حلہ زیب تن کر رکھا تھا اور وہ اترا کر چل رہا تھا۔ اس نے کہا: ابوہریرہ! آپ بہت حدیثیں روایت کرتے ہیں، یہ بتاؤ کہ کیا آپ نے میرے سوٹ کے بارے میں بھی کوئی حدیث سنی ہے؟ حضرت ابوہریرہؓ نے جواب دیا: ''میں نے ابوالقاسم ﷺ سے سنا ہے کہ پہلی امتوں میں ایک شخص تھا۔ اس نے سوٹ پہنا ہوا تھا اور وہ مٹک مٹک کر چل رہا تھا۔ اللہ تعالی نے اسے زمین میں گاڑ دیا، اور وہ قیامت تک اسی طرح زمین میں دھنستا چلا جائے گا'' (۳۹)۔ مجھے نہیں معلوم کہ کیا وہ تمھارے قبیلے کا تھا۔

ابوریہ نے یہ واقعہ ابن کثیر (۴۰) کے حوالے سے نقل کیا ہے اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس شخص کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ استفسار نہیں کر رہا تھا؛ بلکہ حضرت ابوہریرہؓ کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اسی لیے اس نے یہ نہیں کہا کہ ''تمھیں احادیث رسول یاد ہیں؟''؛ بلکہ یہ کہا: ''آپ حدیثیں بہت روایت کرتے ہیں''۔

اس سلسلے میں چند باتیں عرض ہیں:

- سائل نہ صحابی تھا اور نہ کبار تابعین میں سے تھا۔ وہ قریش کا ایک کھلنڈرا نوجوان تھا۔ اسے حضرت ابوہریرہؓ کی قدر کیا معلوم!
- وہ ایک آوارہ نوجوان تھا۔ مسند دارمی (۴۱) کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت ابوہریرہؓ نے اسے یہ حدیث سنائی تو اس نے اترا کر پوچھا: ''کیا وہ نوجوان اس طرح چلتا تھا؟''۔ اور اس نے خاص طرح سے چل کر دکھایا۔ اسی دوران اسے ایسی ٹھوکر لگی کہ پاؤں ٹوٹنے لگا۔ یہ حضرت ابوہریرہؓ کی کرامت تھی کہ اللہ تعالی نے ان کا مذق اڑانے والے شخص کو اس طرح سزا دی۔
- آوارہ مزاج لوگ علما اور صلحا کا ہر دور میں مذاق اڑاتے رہے ہیں۔ ایسا انبیا کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ کیا ان کے طرز عمل سے علما وصلحا کی بے توقیری ثابت ہوسکتی ہے؟
- یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی واقعہ ہے۔ اگر کوئی دوسرا واقعہ ہوتا تو ابوریہ اسے بھی ضرور پیش کرتا۔ اب اس طرح کے ایک واقعے کی بنیاد پر یہ دعوی کرنا کہ ''لوگ حضرت ابوہریرہؓ کا مذاق اڑاتے تھے'' کہاں تک درست ہوسکتا ہے۔ کیا ایک واقعہ اس عمومی دعوے کی دلیل بن سکتا ہے؟۔

۱۱۔ کثرتِ روایت

ابوریہ (۴۲) نے حضرت ابوہریرہؓ کی کثرتِ روایت پر بھی تعجب کا اظہار کیا ہے۔

علامہ ابن حزم (۴۳) کی تحقیق کے مطابق حضرت ابوہریرہ کی کل روایات کی تعداد ۵۳۷۴ ہے۔ اس کثرتِ روایت کا سبب ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یہاں حضرت ابوہریرہؓ کی وہ تقریر پیش کرتے ہیں جو انھوں نے مروان کے سامنے کی تھی۔ ابن کثیر

(۴۴) نے روایت کی ہے کہ حضرت حسنؓ کو حضورﷺ کے قریب دفن کرنے کے سلسلے میں حضرت ابو ہریرہؓ اور مروان کے درمیان نزاع ہوا، تو مروان نے غصے میں کہا: ''آپ رسول اللہﷺ سے بکثرت روایت کرتے ہیں، حالاں کہ وفات رسولﷺ سے تھوڑے عرصے قبل ہی مدینہ آئے تھے؟''۔

اس کے جواب میں حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا:

''ہاں میں ۷ ھ میں خیبر کے موقع پر رسول اللہﷺ کی خدمت میں آیا۔اس وقت میری عمر تیس کے اوپر تھی۔اور وفات تک آپ کے ساتھ رہا۔آپ کے ساتھ آپ کے گھر میں جاتا اور آپ کی خدمت کرتا۔ان دنوں میں تنگ دست تھا؛ مگر ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتا، آپ کے پیچھے نماز پڑھتا، آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتا۔اس طرح مجھے حدیث کا سب سے زیادہ علم حاصل ہوگیا۔بہت سے صحابہ صحبت اور ہجرت میں مجھ پر فوقیت رکھتے تھے؛ مگر وہ بھی مجھ سے حدیث کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ان میں حضرت عمر، عثمان، علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم جیسے حضرات بھی تھے۔اللہ کی قسم! مدینے کی کوئی حدیث مجھ پر مخفی نہ رہی''۔

پھر آپ نے فرمایا: ''ابو عبدالملک (مروان کی کنیت)! جو چاہے مجھ سے پوچھ لے، میرے پاس علم کا بڑا ذخیرہ پائے گا''۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی اس تقریر کے بعد مروان آپ سے لرزاں وترساں رہا کرتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ حضورﷺ کے ساتھ صرف تین سال رہے۔اور اتنی قلیل مدت میں روایت میں سب سے فوقیت لے گئے؛ مگر اس میں کوئی تعجب وانکار کی بات نہیں؛ اس لیے کہ بہت سے طلبہ اپنے استاد کی صحبت میں دوسروں کی بہ نسبت بعد میں آتے ہیں؛ مگر علم ومعلومات میں ان سے بڑھ جاتے ہیں، اور انھیں ان کے اساتذہ کے بارے میں مرجع اور سند سمجھا جانے لگتا ہے۔اور ایسا کیوں نہ ہو کہ جو شخص کسی چیز کے لیے خود کو وقف کردے، اسے یہ مقام حاصل ہو ہی جاتا ہے۔

یہ ہے حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں تاریخ کا سیدھا سچا فیصلہ، اور ابوریہ جو کچھ

بھی اس طرح کی باتیں بیان کرتا ہے کہ صحابہ ان کی تکذیب کرتے تھے یا ان کی روایات کے بارے میں شک کرتے تھے، تو وہ کھلا ہوا جھوٹ ہے، جو اس نے ایسی کتابوں سے نقل کیا ہے، جنھیں علمی مصادر قرار دیتے ہوئے ایک طالب علم کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔

ابوریہ کے چند بے بنیاد دعوے

ذیل میں ہم ابوریہ کے چند بے بنیاد دعووں کا پردہ فاش کرتے ہیں:

۱۔ ابوریہ (۴۵) نے دعوی کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کو درے سے مارا تھا اور فرمایا تھا: ''تم نے بہت حدیثیں روایت کی ہیں۔ غالب گمان ہے کہ تم نے حضور ﷺ پر جھوٹ باندھا ہے''۔

ہم چیلنج کرتے ہیں کہ ابوریہ اس روایت کو کسی معتبر کتاب سے ثابت کر کے دکھائے۔ وہ ایسا ہرگز نہیں کرسکتا۔ البتہ عربی ادب کی وہ کتابیں جو ہر رطب ویابس سے پر ہوتی ہیں، اور شیعہ کی کتابیں، جو حضرت ابوہریرہؓ کے بغض سے بھری ہوتی ہیں، ہمارے نزدیک قابل اعتبار نہیں۔

تعجب ہے کہ ابوریہ جن کتابوں سے اقتباسات لیتا ہے، ان کا بکثرت حوالہ دیتا ہے- اگرچہ یہ معلوم ہے کہ وہ ان میں تصرف کردیا کرتا ہے- مگر تعجب ہے کہ اس نے اس روایت کا کوئی حوالہ بھی نہیں دیا ہے، آخر کیوں؟ (۴۶)

۲۔ اس نے دعوی کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوہریرہؓ کو کثرت روایت پر جلاوطن کرنے کی دھمکی تھی۔ یہ بات اس نے ابن عساکر اور ابن کثیر کے حوالے سے نقل کی ہے (۴۷)۔

روایت سے روکنے کی جہاں تک بات ہے تو ایسا صرف حضرت ابوہریرہؓ کے ساتھ نہیں تھا؛ بلکہ حضرت عمرؓ تمام ہی لوگوں کو اس سے منع کرتے تھے، اور اس کی بہت سی حکمتیں تھیں؛ البتہ یہ بات کہ آپ نے حضرت ابوہریرہؓ کو جلاوطنی کی دھمکی دی تھی، ابوریہ کی خانہ ساز

ہے۔ہاں ابن کثیر کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے یہ دھمکی کعب احبار کو دی تھی، جو کہ اسرائیلی روایات بیان کرتے تھے۔ابوہریرہؓ کو دھمکی دینے کا ذکر کسی کتاب میں موجود نہیں (۴۸)۔پھر ابن کثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے حضرت ابوہریرہؓ کو کثرت روایت سے منع کرنے کی حکمت یہ تھی کہ بسا اوقات لوگ کثرت کے چکر میں فہم وتدبر سے غافل ہوجاتے ہیں،جس کی وجہ سے ان کی روایتوں میں غلطی پیدا ہوجانے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔اس اندیشے کی وجہ سے آپ نے ایسا کیا۔پھر روایتوں سے سے یہ بھی پتہ چلتا کہ حضرت عمرؓ نے انھیں بعد میں اس (کثرت) کی اجازت دے دی تھی۔

۳۔ ابوریہ (۴۹) نے دعوی کیا ہے کہ بہت سے صحابہ نے جن میں حضرت عائشہؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ،حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ شامل ہیں،حضرت ابوہریرہؓ کی تکذیب کی تھی اوران کو مطعون کیا تھا۔ابوریہ نے یہ قول ابن قتیبہ کی طرف منسوب کیا ہے۔

اس قول کو ابن قتیبہ کی طرف منسوب کرنا ابوریہ کا صریح جھوٹ ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ابن قتیبہ نے یہ قول نظامیہ اور معتزلہ سے نقل کرکے اس کی سخت تردید کی ہے اور حضرت ابوہریرہؓ کا پرزور دفاع کیا ہے (۵۰)۔

جن صحابہ کے اس نے نام پیش کیے ہیں،ہم اسے چیلنج کرتے ہیں کہ وہ کوئی ایک بھی معتبر تاریخی شہادت پیش کردے جس سے ثابت ہو کہ فلاں صحابی نے حضرت ابوہریرہؓ پر جھوٹی حدیثیں بیان کرنے کی تہمت لگائی تھی۔وہ تھک کر عاجز ہوجائیں گے،مگر وہ ایک بھی شہادت پیش نہ کرسکیں گے؛البتہ اگر وہ کوئی عبارت عیون الأخبار یا بدائع الزھور جیسی غیر مستند کتابوں سے یا ابن ابی الحدید، اسکافی اور نظام معتزلی وغیرہ سے بیان کریں،تو اس کا کوئی اعتبار نہیں؛اس لیے کہ یہ کتابیں اور یہ لوگ اہل علم کے یہاں کسی وقعت کے حامل نہیں۔

ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ بسا اوقات حضرت ابوہریرہؓ کوئی ایسی روایت بیان کرتے،تب حضرت عائشہؓ کو اس پر بڑا تعجب ہوتا؛مگر جب حضرت ابوہریرہؓ فرماتے کہ آپ گھر میں رہتی تھیں اور میں ہر وقت آپ ﷺ کے ساتھ رہتا تھا،اس لیے آپ کو ان کے بارے میں پتہ نہیں،تو حضرت عائشہؓ ان کی بات تسلیم کرلیتیں اور فرماتیں کہ ابوہریرہ صحیح کہہ

رہے ہیں۔

اور بعض مواقع پر ایسا بھی ہوا کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے حضرت عائشہؓ کی بات تسلیم کی، جیسا کہ جنبی شخص کے روزے کے بارے میں دونوں میں اختلاف ہوا، تو حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ گھریلو حالات وکوائف کے بارے میں حضرت عائشہؓ زیادہ بہتر جانتی ہیں۔اور میں نے تو یہ روایت ایک صحابی سے سنی تھی۔

یہ ان دونوں حضرات کا ایک دوسرے کے ساتھ احترام کا معاملہ تھا، جس سے ابوریہ جیسے لوگ تہی دست ہیں۔

۴۔ ابوریہ(۵۱) نے ابن کثیر سے نقل کیا ہے کہ حضرت زبیرؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات سننے کے بعد فرمایا: صدق، کذب، (اس نے سچ بولا اور جھوٹ کہا)۔

یہاں ابوریہ نے اہل کتاب کی روش اختیار کی ہے کہ آدھی ادھوری بات نقل کر دی، اور کچھ حصہ چھوڑ دیا، حالاں کہ ابن کثیر (۵۲) نے اس کے بعد لکھا ہے کہ عروہ نے اپنے والد حضرت زبیرؓ سے پوچھا: آپ کے اس قول صدق، کذب کا کیا مطلب ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: ''اس میں شک نہیں کہ ابو ہریرہؓ نے یہ حدیثیں حضورﷺ سے سنی ہوں گی؛ مگر وہ بعض احادیث کو صحیح سے سمجھ نہیں پاتے''۔(یعنی کذب سے مراد غلط مفہوم سمجھنا ہے)۔

ذرا بتایئے اس میں کہاں حضرت زبیرؓ نے ابو ہریرہؓ کی تکذیب کی ہے۔اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کی صداقت کو قبول کیا ہے؛ البتہ یہ کہا کہ وہ بعض احادیث کو صحیح سے سمجھ نہیں پاتے۔اور دراصل یہ تو فہم کا اختلاف ہے کہ حضرت زبیرؓ بعض احادیث کا جو مطلب سمجھ رہے ہوتے، حضرت ابو ہریرہؓ کے نزدیک ان کا مطلب کچھ اور ہوتا۔

۵۔ ابوریہ (۵۳) نے حافظ ابن عبدالبر کی جامع بیان العلم (۵۴) کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ حدیث بیان کی ''جو شخص میت کو غسل دے تو وہ غسل کرے اور جو جنازے کو اٹھائے تو وہ وضو کرے''۔حضرت ابن مسعودؓ نے انکار کیا اور انھیں سخت بات کہی۔

یہاں بھی ابوریہ نے علمی خیانت دکھائی ہے۔ دراصل یہ شخص قارئین کو دھوکہ دینے اور علمی حقائق کو الٹ پلٹ کرنے کا خوگر ہے۔

بات یہ ہے کہ ابن عبدالبر نے اس کتاب میں ایک خاص فصل قائم کی ہے، جس میں ایسے اقوال وفتاوی بیان کیے ہیں، جن میں علما نے ایک دوسرے کی نکیر اور تردید کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے کئی واقعات بیان کیے ہیں، جیسے جب مرتدین سے قتال کے سلسلے میں صحابہ نے حضرت ابوبکرؓ سے اختلاف کیا تو آپ نے ان کی تردید کی۔ اسی طرح گھر والوں کے رونے کی وجہ سے میت کو عذاب ہونے والی روایت پر حضرت عائشہؓ نے حضرت ابن عمر کی تردید کی۔ اسی طرح اور بھی مثالیں پیش کی ہیں۔ انھی میں ایک یہ واقعہ ہے۔

بات بس اتنی ہے کہ اس مسئلے میں حضرت ابن مسعودؓ کا فتوی الگ ہے اور حضرت ابوہریرہؓ کا الگ، اور حضرت ابن مسعودؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کے فتوی کو قبول نہیں کیا۔ اس میں یہ کہاں ہے کہ انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ پر حدیث میں جھوٹ بولنے کا الزام لگایا؟

۶۔ ابوریہ نے اپنی اس تحقیقی بحث کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے: ''صحابۂ کرام نے حضرت ابوہریرہؓ پر جو تنقید کی اور جس طرح ان کی روایات پر شک کا اظہار کیا، اس کی تفصیل بڑی طویل ہے، جسے ہم بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہیں'' (۵۵)۔

یہ سراسر جھوٹ اور بہتان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ پر الزام تراشی کے لیے جو کچھ مواد مل سکتا تھا، اس نے وہ سب جمع کر دیا ہے، اب بیان کرنے کو اس کے پاس کچھ باقی ہی نہیں رہ گیا ہے۔

رہی یہ بات کہ بعض صحابہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی بعض مواقع پر تردید کی، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کا شمار اہل فتوی صحابہ میں ہوتا تھا جیسا کہ ابن القیم نے اعلام الموقعین (۵۶) میں صراحت کی ہے، اس لیے وہ اپنی رائے سے فتوی دیتے اور بعض صحابہ اپنے نقطۂ نظر سے اسے صحیح نہ سمجھتے تو اس کا رد فرماتے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ ان پر جھوٹ بولنے کا الزام لگاتے ہوں۔ یہ بس نقطۂ نظر کا اختلاف ہوتا تھا۔

۷۔ ابوریہ (۵۷) نے ایک غیر صحیح روایت نقل کی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ حضرت ابوہریرہؓ کی روایات سے استدلال نہیں کرتے تھے۔

یہ روایت صریح بہتان ہے۔ فقہ حنفی کا ایک بڑا حصہ صرف حضرت ابوہریرہؓ کی روایات پر مبنی ہے۔ رہا یہ کہنا کہ احناف حضرت ابوہریرہؓ کو فقیہ نہیں مانتے، تو یہ بھی غلط ہے۔ ایسی بات صرف عیسی بن ابان اور ان کے ہمنواؤں نے کہی ہے۔ (اس کی تفصیل دوسرے شمارے میں شائع حضرت ابوہریرہؓ پر اعتراضات...میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے)۔

۸۔ محترم ابوریہ (۵۸) نے لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ حضرت انسؓ وابن عمرؓ وغیرہ کی طرح صغار صحابہ سے روایت سن کر براہ راست رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے تھے اور یہ تدلیس ہے۔

اس کے بعد موصوف نے تدلیس کی مذمت میں علما کے بہت سے اقوال بیان کیے ہیں۔ افسوس کہ ابوریہ کو نہیں معلوم کہ صحابی کا صحابی سے سن کر براہ راست رسول اللہ ﷺ سے روایت کرنا تدلیس نہیں؛ بلکہ ارسال کہلاتا ہے، اور مرسل صحابہ روایت باجماع محدثین مقبول ہوتی ہے۔

۹۔ ابوریہ (۵۹) نے یہ دعوی کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ جھوٹی حدیثیں گھڑنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ اس سے کسی حلال کی تحریم اور حرام کی تحلیل لازم نہ آتی ہو۔ موصوف نے اپنے دعوے کے ثبوت کے لیے کچھ ایسی روایات بھی پیش کی ہیں جو حضرت ابوہریرہؓ کے واسطے سے نبی اکرم ﷺ سے منقول ہیں۔ مثلاً: آپ نے فرمایا: ''جب تم کسی حرام کو حلال اور حلال کو حرام نہ ٹھہراؤ تو اسے میری جانب منسوب کرنے میں کوئی حرج نہیں''۔ یا یہ حدیث کہ ''جس نے رضائے الٰہی کی خاطر کوئی حدیث بیان کی، تو اسے میری ہی حدیث سمجھو، گو کہ اسے میں نے بیان نہ کیا ہو''۔

اس طرح کی تمام روایات کو علما نے موضوع قرار دیا ہے۔ ہوا یہ ہے کہ لوگوں نے اپنی طرف سے گھڑ کر انھیں حضرت ابوہریرہؓ کی جانب منسوب کر دیا، حالاں کہ انھوں نے یہ روایات بیان نہ کی تھیں۔ اب بتایئے اس میں حضرت ابوہریرہؓ کا کیا قصور؟ قصور تو سارا ان

کذابوں کا ہے، جنھوں نے یہ روایات وضع کی ہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ موصوف نے ان میں سے ایک روایت کو ابن حزم کی کتاب الاحکام کی طرف منسوب کرکے نقل کیا ہے، جب کہ ابن حزم نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔اب اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ ابوریہ قارئین کو گمراہ کرنا چاہتا ہے۔

۱۰۔ ابوریہ (٦٠) کا دعویٰ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کعب احبار سے روایات سن کر براہ راست رسول اکرم ﷺ سے روایت کرتے تھے۔

ابوریہ کے پاس اس دعوے کی کوئی دلیل نہیں۔ یہاں بھی اس نے علما کی عبارتیں توڑ مروڑ کر اپنا خودساختہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس نے ذکر کیا ہے کہ علما نے اکابر کی اصاغر سے روایتِ حدیث کے سلسلے میں حضرت ابوہریرہؓ، عبادلہ اربعہ اور حضرت معاویہؓ وانسؓ وغیرہ کے نام ذکر کیے ہیں کہ یہ لوگ کعب احبار سے روایت کرتے تھے۔

اس موقع پر موصوف نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ گویا یہ حضرات کعب احبار سے احادیث رسول سنتے اور پھر براہ راست رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے۔ یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہے؛ اس لیے کہ یہ حضرات کعب احبار سے سابقہ اقوام کے اخبار وواقعات روایت کرتے تھے نہ کہ احادیث رسول۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ کعب احبار نے آنحضور ﷺ کا زمانہ ہی نہیں پایا تھا، تو صحابہ اس سے احادیث رسول کیوں کر روایت کرتے؟

ابوریہ (٦١) نے اپنے دعوے (کہ حضرت ابوہریرہؓ کعب احبار سے احادیث سن کر رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کردیتے تھے) کی دلیل کے طور پر عجیب وغریب طرح سے استدلال کیا ہے، چنانچہ اس نے اس ضمن میں ایک روایت یہ پیش کی ہے:

''مسلم نے بسر بن سعید سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''خدا سے ڈرو، اور حدیثوں کو اچھی طرح یاد رکھو؛ اس لیے کہ ہم حضرت ابوہریرہؓ کی مجلس میں حاضر تھے، وہ حضور ﷺ کی حدیثیں سناتے اور کعب احبار سے بھی روایت کرتے۔ پھر جب آپ چلے جاتے تو میں بعض لوگوں کو دیکھتا کہ وہ (صحیح سے یاد نہ کرنے کی وجہ سے) رسول اللہ ﷺ کی

حدیثوں کو کعب کی طرف منسوب کر دیتے اور کعب کی روایت کو رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کر دیتے۔ اس لیے خدا سے ڈرو اور حدیثوں کو اچھی طرح یاد کرلو' (٦٢)۔

حیرت ہے ابوریہ کی عقل پر! ذرا بتائیے کہ غلط روایات حضرت ابو ہریرہؓ کرتے تھے یا ان کے شاگرد؟ تعجب ہوتا ہے کہ موصوف نے اس روایت کو سمجھا نہیں، یا دانستہ غلط نتیجہ نکالا۔

اسی طرح موصوف (٦٣) نے اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر ایک روایت یہ پیش کی ہے جسے مسلم (٦٤) نے روایت کیا ہے جس میں آسمان وزمین کی تخلیق کا ذکر ہے اور جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، جس کے آغاز میں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا...... اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد موصوف نے امام بخاری اور ابن کثیر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ روایت کعب احبار سے سنی تھی۔

ابوریہ نے اس قول کو اپنی بڑی مضبوط دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، حالاں کہ اس کا مطلب یہ کہیں سے نہیں نکلتا کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے اسے کعب احبار سے سن کر رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کر دیا؛ بلکہ امام بخاریؒ اور ابن کثیرؒ دراصل امام مسلمؒ پر اعتراض کر رہے ہیں کہ انھوں نے اس روایت کو مرفوع قرار دیا ہے، حالانکہ یہ مرفوع نہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے اسے موقوفاً بیان کیا تھا؛ مگر بعد کے راویوں نے اسے مرفوع بنا ڈالا۔ امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ (٦٥) اور ابن کثیرؒ (٦٦) نے اپنی تفسیر میں یہی لکھا ہے۔

ذرا سوچیے کہ ابوریہ کے دعوے اور مذکورہ بالا حقیقت میں کتنا فرق ہے، یا للعجب!

اس بحث میں ابوریہ نے وہ تمام گالیاں یکجا کر دی ہیں، جو شیعہ نے اپنی کتب میں حضرت ابو ہریرہؓ کو دی ہیں۔

اور پھر اس نے دعویٰ کیا ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں ایسی بے نظیر تحقیقات پیش کی ہیں، جنھیں آج تک کوئی پیش نہیں کر سکا ہے۔ اس نے شیعوں کے حوالے سے ایسی باتیں بھی لکھی ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ حضرت معاویہؓ کو خوش کرنے کے لیے کبار صحابہ (واہل بیت) کو برا بھلا کہتے اور اس کے لیے جھوٹی حدیثیں بیان کرتے تھے۔

ہم جس دور میں جی رہے ہیں، اس میں سنی وشیعہ یا دیگر اسلامی فرقوں کے درمیان

انتشار وافتراق کو ہوا دینے والی بات کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ وقت باہمی اتحاد کا ہے نہ کہ تفرقہ بازی کا۔ ابوریہ نے اپنی کتاب کو شیعہ کے نزدیک مقبول بنانے کے لیے یہ کام کیا ہے۔ اسے اختیار ہے وہ جو چاہے کرے؛ مگر یہ جھوٹا دعوی نہ کرے کہ اس کی تحقیقات علمی تحقیق کے اصول وقواعد پر مبنی ہیں۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ اہل بیت سے محبت کرنے والے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حضرت حسنؓ کو رسول اللہ ﷺ کے قریب دفن کرنے کے لیے حاکم وقت مروان سے بھی الجھ گئے تھے۔ اسی طرح آپ حضرت حسنؓ وحسینؓ کے ساتھ ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے محاصرے کے دوران حضرت عثمانؓ کی حمایت وحفاظت کی تھی؛ البتہ وہ حضرت علیؓ وحضرت معاویہؓ کے درمیان ہونے والے واقعات میں بعض دیگر کبار صحابہؓ کی طرح کنارہ کش رہے تھے اور انھوں نے کسی کی بھی طرف داری کرنے سے اجتناب کیا تھا۔ وہ اسی کو صحیح سمجھتے تھے، اور اسی پر قائم رہے۔

یہی سچ ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی کہا گیا ہے، وہ سب کذب وافترا ہے۔

☆☆☆

حواشی

(۱) دیکھیے: أضواء علی السنۃ المحمدیۃ: ۱۵۳۔

(۲) دیکھیے: الإصابۃ: ۴/۲۰۴۔

(۳) دیکھیے: أضواء علی السنۃ المحمدیۃ: ۱۵۳۔

(۴) حوالۂ سابق۔

(۵) حوالۂ سابق: ۱۷۰۔

(۶) دیکھیے: سورۂ ہود/ ۲۷-۳۱۔

(۷) دیکھیے: أضواء علی السنة المحمدیة: ۱۵۳۔

(۸) دیکھیے: سیر أعلام النبلاء: ۲/ ۵۸۶۔

(۹) السیرة النبویة لابن ہشام: ۲/ ۲۳۔

(۱۰) الإصابة: ۳/ ۵۲۲۔

(۱۱) دیکھیے: صحیح البخاری، کتاب الجہاد، باب الکافر یقتل المسلم ثم یسلم... رقم: ۲۸۲۷/ کتاب المغازي، باب غزوة خیبر، رقم: ۴۲۳۷، ۴۲۳۸، ۴۲۳۹۔

(۱۲) دیکھیے: فتح الباری: ۸/ ۸۳۔

(۱۳) سفرِ ہجرت کے واقعے کے لیے دیکھیے: کتاب الطبقات الکبیر: ۵/ ۲۳۰-۲۳۱۔

(۱۴) دیکھیے: أضواء علی السنة المحمدیة: ۱۵۴۔

(۱۵) دیکھیے: صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب ما جاء في قول اللہ تعالی: فإذا قضیت الصلوة... رقم: ۲۰۴۷۔

(۱۶) دیکھیے: صحیح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل أبی ہریرة الدوسی، رقم: ۲۴۹۲۔

(۱۷) دیکھیے: شرح النووي علی مسلم: ۱۶/ ۵۳۔

(۱۸) دیکھیے: فتح الباری: ۴/ ۲۳۱۔

(۱۹) دیکھیے: عمدة القاري: ۵/ ۳۹۴۔

(۲۰) دیکھیے: البدایة والنہایة: ۸/ ۱۱۳۔

(۲۱) دیکھیے: أضواء علی السنة المحمدیة: ۱۵۴۔

(۲۲) حوالۂ سابق: ۱۷۲۔

(۲۳) دیکھیے: المقاصد الحسنة: ۲۳۲-۲۳۳۔

(۲۴) دیکھیے: أضواء علی السنة المحمدیة: ۱۵۵۔

(۲۵) دیکھیے: فتح الباری: ۷/ ۶۱۔

(۲۶) أیضاً: ۷/ ۶۲۔

(۲۷) أیضاً۔

(۲۸) دیکھیے: أضواء علی السنة المحمدیة: ۱۵۶-۱۵۷۔

(۲۹) دیکھیے: ثمار القلوب في المضاف والمنسوب للثعالبی: ۱/ ۱۱۲۔

(۳۰) دیکھیے: مقامات بدیع الزماں الہمذانی: ۱۲۲۔ (المقامات المضیریة)۔

(۳۱) ثمار القلوب: ۱/ ۱۱۲۔

(۳۲)   حلیۃ الأ ولیاء:۱/۳۸۲۔

(۳۳)   ''اُضعفنی'' کا لفظ ابن کثیر نے نقل کیا ہے۔دیکھیے :البدایہ والنہایہ:۸/۱۱۲۔

(۳۴)   خاص الخاص للثعالبی:۸۶۔

(۳۵)   دیکھیے :أضواء علی السنۃ المحمدیۃ:۱۶۱۔

(۳۶)   دیکھیے :البدایہ والنہایہ:۸/۱۱۰۔

(۳۷)   حلیۃ الأ ولیاء:۱/۳۸۲۔

(۳۸)   دیکھیے :أضواء علی السنۃ المحمدیۃ:۱۶۱۔

(۳۹)   صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب من جر ثوبہ من الخیلاء، رقم:۵۷۸۹۔

(۴۰)   البدایہ والنہایہ:۸/۱۱۴۔

(۴۱)   دیکھیے :سنن الدارمی:۱۳۴، باب تعجیل عقوبۃ من بلغہ عن النبی حدیث فلم یعظمہ...رقم:۴۴۱۔

(۴۲)   دیکھیے :أضواء علی السنۃ المحمدیۃ:۱۶۱۔

(۴۳)   دیکھیے :أسماء الصحابۃ و ما لکل واحد منھم من العدد:۳۱۔

(۴۴)   دیکھیے :البدایہ والنہایہ:۸/۱۱۴-۱۱۵۔

(۴۵)   دیکھیے :أضواء علی السنۃ المحمدیۃ:۱۶۲۔

(۴۶)   ابن ابی الحدید نے اسے شرح نہج البلاغۃ:۱/۳۶۰ پر اسکافی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ ابوریہ نے یہیں سے نقل کیا ہے۔(سباعیؒ)۔

(۴۷)   دیکھیے :أضواء علی السنۃ المحمدیۃ:۱۶۲۔

(۴۸)   البدایہ میں کعب احبار کے ساتھ ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ کو بھی دھمکی دینے کا ذکر ہے۔دیکھیے :البدایہ والنہایہ:۷/۱۱۳۔

(۴۹)   دیکھیے :أضواء علی السنۃ المحمدیۃ:۱۶۴۔

(۵۰)   دیکھیے :تأویل مختلف الحدیث:۱۱۳-۱۱۸۔

(۵۱)   دیکھیے :البدایہ والنہایہ:۷/۱۱۴-۱۱۵۔

(۵۲)   دیکھیے :أضواء علی السنۃ المحمدیۃ:۱۶۵۔

(۵۳)   دیکھیے :حوالۂ سابق:۱۶۶۔

(۵۴)   دیکھیے :جامع بیان العلم:۱/ ۹۱۵، باب ذکر الدلیل من أقاویل السلف...رقم:۱۷۲۳۔

(۵۵)   ہمارے پاس جو نسخہ ہے، اس میں یہ عبارت موجود نہیں۔ہوسکتا ہے کہ مصنف کے پاس جو نسخہ تھا، اس

میں رہی ہو، بعد میں کسی سبب سے حذف کردی گئی ہو۔

(۵۶) دیکھیے: إعلام الموقعين: ۱/۱۲۔ (المتوسطون فی الفتیا)۔

(۵۷) دیکھیے: أضواء على السنة المحمدية: ۱۷۹۔

(۵۸) أیضاً: ۱۷۳۔

(۵۹) أیضاً: ۱۸۰۔

(۶۰) أیضاً۔

(۶۱) أیضاً: ۱۷۶۔

(۶۲) دیکھیے: التمییز للإمام مسلم: ۹۵، باب ماجاء فی التوقی فی حمل الحدیث، رقم: ۱۰۔

(۶۳) دیکھیے: أضواء على السنة المحمدية: ۱۸۲۔

(۶۴) صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین، باب ابتداء الخلق، رقم: ۲۷۸۹۔

(۶۵) دیکھیے: التاریخ الکبیر: ۱/۴۱۳-۴۱۴۔

(۶۶) تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر: ۱/۳۳۶۔

(۶۷) دیکھیے: المسند للإمام أحمد بن حنبل: ۶/۵۲۲ - ۵۲۴۔

(۶۸) دیکھیے: المستدرک للحاکم: ۳/ ۵۸۷-۵۸۸۔ (کتاب معرفۃ الصحابۃ، ذکر أبی ہریرۃ)۔

☆☆☆

نقد ونظر (قسط: ۴)

سیرت سے متعلق شبہات

تلخیص وترجمہ: محمد فرید حبیب ندوی

چھٹا شبہ
نبی ﷺ کی بحیرا راہب سے ملاقات کا انکار

بعض مشککین اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے بچپن کے اپنے پہلے سفرِ شام میں بحیرا راہب سے ملاقات کی تھی۔ وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ بحیرا ایک فرضی شخصیت ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اور اگر یہ ثابت ہوجائے کہ ملاقات ہوئی تھی تو جو بشارتیں ان کی نبوت سے متعلق بحیرا نے دی تھیں، ان پر اطمینان ہونے کی بجائے ہنسی آتی ہے۔

دراصل اس طرح کی چیزوں کا انکار کر کے ان کا مقصد ان امور کی بابت شک پیدا کرنا ہے جو اہل کتاب کی کتب میں نبی ﷺ کی نبوت سے متعلق موجود ہیں۔

ابطال شبہ

اس شبہ کے ازالے کے لیے ہم تین نقاط پر گفتگو کریں گے:

۱۔ بَحِیرا کوئی غیر معروف نہیں؛ بلکہ ایک حقیقی اور معروف شخصیت ہے۔

۲۔ دراصل بحیرا کا اصل نام 'جرجیس' تھا۔ یہ اس کا لقب تھا۔ معترضین اس کو سمجھ نہ پائے۔ یا یہ بات انھیں معلوم تھی، مگر انھوں نے اس کا خیال نہ کیا کہ وہ 'نسطوری' مذہب کو مانتا تھا جو عام عیسائیوں کے نزدیک کفریہ مذہب ہے، اس لیے انھوں نے اپنی کتابوں میں اس کا تذکرہ نہیں کیا۔

۳۔ اس واقعے میں کوئی بھی بات لائق تعجب یا قابل تضحیک نہیں ہے۔

تفصیل

اولاً:   بحیرا راہب خیالی یا فرضی شخصیت نہ تھا

درست بات یہ ہے کہ بحیرا راہب— جس کے بارے میں اسلامی تاریخی مصادر یہ بیان کرتے ہیں کہ اس نے نبی کریم ﷺ کے لڑکپن میں آپ کو نبوت کی بشارت دی— کوئی خیالی شخصیت نہ تھا۔اس کے بارے میں جو مشہور ملاقات کا واقعہ ہے، وہ محض فرضی قصہ نہیں ؛ بلکہ حقیقت پر مبنی ہے۔بحیرا کی شخصیت ایک تاریخی شخصیت ہے۔وہ نصرانی عالم تھا،جو بصریٰ (شام) کے علاقے میں اپنے گرجا میں رہتا تھا۔وہ اس گرجا میں پادری (راہب) کے منصب پر فائز رہا،اور علم نصرانیت کا وارث ہوا۔اس نے علم نصرانیت میں اونچا مقام حاصل کیا،حتی کہ بہت سے لوگ اس کے شاگرد ہوئے۔سلمان فارسیؓ بھی اسلام سے قبل اس کے شاگرد رہ چکے ہیں۔

اس لیے بحیرا کوئی ہوائی شخصیت نہیں ہے۔پھر یہ بھی قابل ذکر ہے کہ بحیرا کا تذکرہ بازنطینی کتب میں بھی موجود ہے۔ان کے مطابق بحیرا 'نسطوری' مذہب کا پیروکار تھا۔یہ مذہب 'نسطور' اور آریوس' کی تعلیمات پر مشتمل تھا۔یہ راہب حضرت عیسی کی الوہیت کا انکار کرتا تھا۔اس کا کہنا تھا کہ حضرت عیسی کو 'الٰہ' کہنا جائز نہیں ہے۔انھیں 'کلمہ' کہنا چاہیے۔اسی طرح ان کی والدہ کو 'والدۃ الناسوت' کہنا چاہیے،نہ کہ والدۃ اللہ۔اس کے پاس سے جو قافلے گزرتے تھے،وہ انھیں بت پرستی سے منع کرتا اور توحید کی دعوت دیتا تھا۔

اور یہ بات معلوم ہے کہ 'نسطوری مذہب' (جس پر بحیرا راہب تھا) کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالی ایک ہے،مگر اس کے تین اقانیم (صفات) ہیں:وجود،علم اور زندگی۔اور یہ اقانیم نہ ذات پر زائد ہیں،اور نہ عین ذات ہیں۔اور 'کلمہ' عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے جسد میں اس طرح متحد ہوا،جیسے مہر کا نقش موم پر ظاہر ہوتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ بحیرا کا تذکرہ خود ان لوگوں کی کتابوں میں بھی موجود ہے تو یہ بات ہم صرف اس لیے کہتے ہیں؛ تاکہ ایسے لوگوں کے سامنے جو اس کی شخصیت کو فرضی وخیالی بتاتے ہیں، یہ واضح کردیں کہ جسے تم خیالی کہہ رہے ہو،وہ خود تمھاری کتابوں میں موجود ہے۔ورنہ ہمارے نزدیک اس کا ثبوت اتنا پکا اور یقینی ہے کہ اس طرح کی کسی دلیل کی

کوئی ضرورت نہیں۔

دوسری بات یہ بھی واضح رہے کہ جب ہم بحیرا کے وجود کی بات کرتے ہیں تو یہ سوچ کر کرتے ہیں کہ اس طرح کی ایک شخصیت گزری ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہو بہو اسی نام سے گزری ہو۔ ممکن ہے کہ بعینہ یہ نام نہ ملے؛ لیکن شخصیت کا وجود یقینی ہے۔ نام نہ ملنے کی وجہ یہ ہے کہ عرب لوگ دوسری زبانوں کے نام جب عربی میں داخل کرتے ہیں تو ان میں بڑی تحریف (تبدیلی) کر دیتے ہیں؛ بلکہ ایسا صرف عرب ہی نہیں کرتے، ہر زبان والے ایسا ہی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر عرب 'لوزاریق' کہتے ہیں جب کہ اصل 'رودریجو' ہے۔ اسی طرح وہ مقوقس کہتے ہیں، جب کہ اصل 'کیرس' ہے۔ ایسے ہی وہ 'فارقلیط' کہتے ہیں، جب کہ اصل 'باراکلیتو س' ہے۔ اسی طرح مغرب کے لوگوں نے بھی عربی ناموں کو بدل کر اپنے مطابق ڈھالا ہے۔ چنانچہ وہ 'علاء الدین' کو 'الادان'، 'ابن سینا' کو 'فاینسین' اور 'صلاح الدین' کو 'سلادان' کہتے ہیں۔

ثانیاً: بحیرا راہب کی شخصیت سے متعلق خیالی ہونے کے دعوے کی صحیح توجیہ

جن لوگوں نے 'راہب جرجیس' ملقب بہ بحیرا کی شخصیت کے خیالی ہونے کا دعویٰ کیا، وہ دو احتمال سے خالی نہیں:

یا تو یہ لوگ سمجھ نہیں پائے کہ جرجیس (سرجیس) اور بحیرا سے مراد ایک ہی شخصیت ہے۔ جرجیس اس کا اصل نام ہے اور بحیرا لقب ہے۔ آرامی زبان میں بحیرا کے معنی 'منتخب' ہوتے ہیں۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ اس کا لقب تھا۔ نام سرجیس یا جرجیس تھا۔ اس لیے بالکل ممکن ہے کہ تاریخی مصادر میں کہیں اس کا تذکرہ نام کے ساتھ ہو اور کہیں لقب کے ساتھ۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ان لوگوں کو نام اور لقب کے اس ربط کا ادراک تھا، مگر یہ سمجھ نہیں پائے کہ بحیرا راہب کے مذہب اور عام کیتھولک اور آرتھوڈوکس راہبوں کے مذہب کے درمیان کتنا فرق تھا۔ ان لوگوں نے اس فرق کا خیال نہیں کیا اور نتیجۃً بحیرا کا تذکرہ ان لوگوں کی کتابوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی جو مذہبی اعتبار سے اس کے دشمن تھے اور اس کو کافر سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے وہ اپنی کتابوں میں اس کا تذکرہ کیوں کرتے؟ اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ بحیرا اپنی خانقاہ میں الگ تھلگ رہتا تھا۔ اگر وہ عام نصاریٰ کے مذہب پر ہوتا تو کسی معروف گرجا میں ہوتا۔

ثالثاً: بحیرا کی نبی کریم ﷺ کے متعلق پیشین گوئی اور ملاقات کوئی عجیب یا قابلِ تضحیک بات نہیں؛ بلکہ یہ بشارات نبوت کا ایک حصہ ہے۔

بحیرا کی نبی کریم ﷺ کے متعلق پیشین گوئی اور ملاقات کوئی عجیب یا خندہ آور بات نہیں؛ بلکہ یہ بشارات نبوت کا ایک حصہ ہے، جیسا کہ دیگر اہل کتاب (مثلاً آپ ﷺ کے دادا عبد المطلب کے سامنے سَیف بن ذی یزن) نے بھی آپ سے متعلق پیشن گوئیاں کی تھیں۔ یہ علامات نبی اکرم ﷺ کی نبوت سے قبل کی ارہاصات ہیں۔ بحیرا نے جو کچھ کہا، وہ اہل کتاب کی کتب میں پہلے سے موجود ہے؛ بلکہ تورات وانجیل میں آپ ﷺ کا تذکرہ آپ کے اوصاف سے ساتھ کیا گیا ہے۔

امام محمد ابوزہرہ نے اس واقعے کی جو تفصیلات بیان کی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بحیرا علم کتاب (تورات وانجیل) رکھتا تھا اور عموماً قافلوں سے نہیں ملتا تھا؛ لیکن جب نبی اکرم ﷺ کے قافلے کے ساتھ ایک خاص علامت (بادل کا سایہ، درخت کا جھکنا) دیکھی، تو وہ باہر آیا اور لڑکے (محمد ﷺ) کو دیکھ کر ان علامات کو اس پر صادق پایا۔ اس نے آپ کے شانوں کے مابین مہر نبوت بھی دیکھی۔ پھر اس نے ابوطالب کو مشورہ دیا کہ اسے واپس مکہ لے جاؤ اور یہود سے محتاط رہو۔

اس لیے اس واقعے میں کوئی بھی بات قابل تعجب یا لائق تضحیک نہیں ہے؛ البتہ اگر اعتراض یہ ہے کہ اس نام کے کسی راہب کا ذکر نہیں ملتا تو- بر سبیل فرض- ہم عرض کرتے ہیں کہ نام سے کیا لینا۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ ایک راہب نے آپ کو دیکھا تو آپ کی نبوت کی پیشن گوئی کی۔ اب اس راہب کا نام خواہ کچھ بھی ہو۔

معلوم نہیں کیوں سر ولیم میور نے اس واقعے کی تضحیک کی ہے۔ آخر اس میں تضحیک کی کیا بات ہے؟ ایسا ردعمل نہ تو مؤرخین نے دیا، نہ یہ عقلاً درست ہے۔ پھر انھیں سمجھنا چاہیے تھا کہ وہ کسی عام شخص کے سوانح نہیں لکھ رہے؛ بلکہ ایک نبی کی سیرت لکھ رہے ہیں، اور نبیوں کی زندگی میں خوارق کا ظہور کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ کی زندگی میں بہت سے ایسے خوارق پیش آئے، جیسے حضرت حلیمہ کے گھر میں رزق میں برکت ووسعت، شق صدر اور دیگر واقعات۔ نبوت سے پہلے کے خرقِ عادت امور کو 'ارہاصات' اور نبوت کے بعد کے امور کو معجزات کہا جاتا ہے۔ یہ

واقعات تاریخی، دینی، اور مشاہداتی؛ تینوں اعتبار سے ثابت ہیں:

تاریخی اعتبار سے: نبی کریم ﷺ کے معاصرین اور بڑے بڑے صحابہ کرام نے ان علامات کو دیکھا، ان کا تذکرہ کیا، اور مؤرخین نے ان کو روایت کیا۔ اگر ہم ان کی گواہی اور نقل کو باطل کر دیں، تو تاریخ کی کوئی بھی معتبر روایت باقی نہیں رہتی۔

دینی اعتبار سے: انبیا علیہم السلام کے معجزات اور اولیا کی کرامات پر ایمان رکھنا دین کا متفقہ اصول ہے۔ ان معجزات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات بھی شامل ہیں کہ انھوں نے بچپن میں بات کی، نابینا اور کوڑھیوں کو شفا دی، اور اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کیا۔ اور مسلمانوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ سب مضحکہ خیز باتیں ہیں۔

مشاہداتی اعتبار سے: ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے غیر نبی و ولی افراد بھی بعض ایسے معجز نما کارنامے انجام دے ڈالتے ہیں جو عام افراد نہیں کر پاتے۔ ہم نے دیکھا کہ مصر کے ایک عام کسان کا ان پڑھ بیٹا ریاضی کے مشکل سے مشکل سوال کو چٹکیوں میں حل کر دیتا ہے۔ وہ سرخیوں میں آیا اور بڑے بڑے ماہرین نے اس کا امتحان لیا۔ یہ ہمارے دور کی تازہ مثال ہے۔ اب اگر مسٹر میور جیسا کوئی شخص ایک صدی بعد آئے اور دعویٰ کرے کہ یہ فرضی واقعہ ہے جسے اہل مصر نے گھڑ لیا ہے تو کیا اس سے اس واقعے کی سچائی پر کچھ بھی فرق پڑے گا؟

پھر انبیا علیہم السلام کے معجزات تو تواتر سے ثابت ہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام اور دیگر انبیا کے ساتھ بہت سے ایسے واقعات پیش آئے ہیں۔ حضرت مریم کو غیر موسمی پھل ملتے تھے، حضرت عیسیٰ نے مٹی سے پرندہ بنایا اور پھونک ماری تو وہ اُڑ گیا۔ کیا کسی نے کہا کہ یہ چیزیں قابل تضحیک ہیں؟ اگر نبی کریم ﷺ کی زندگی میں بھی غیر معمولی واقعات پیش آئے تو وہ قابل تضحیک کیسے ہو گئے؟ کیا یہ تعصب نہیں ہے؟

☆☆☆

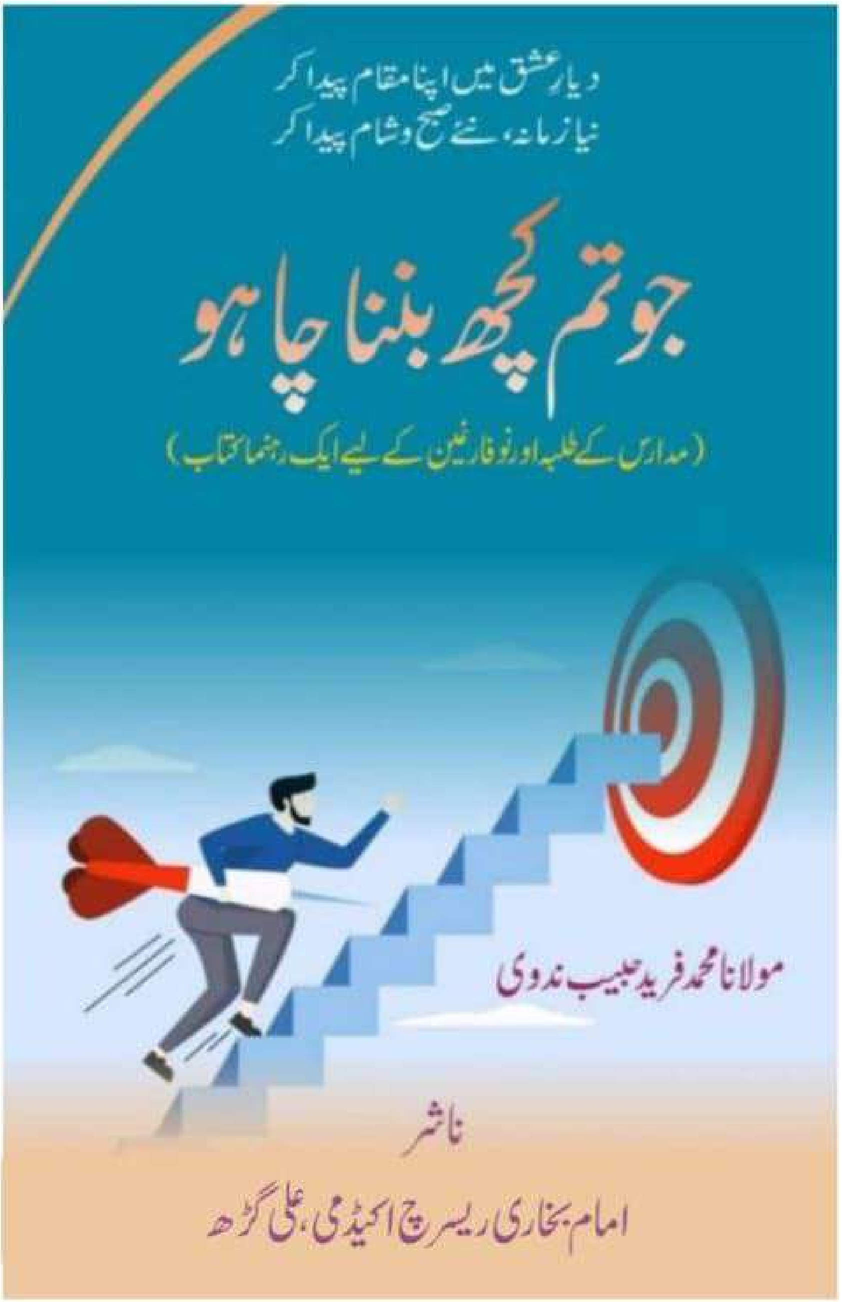
دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح وشام پیدا کر
جو تم کچھ بننا چاہو
(مدارس کے طلبہ اور نوفارغین کے لیے ایک رہنما کتاب)
مولانا محمد فرید حبیب ندوی
ناشر
امام بخاری ریسرچ اکیڈمی، علی گڑھ

بانی اکیڈمی کی ایک اہم کتاب

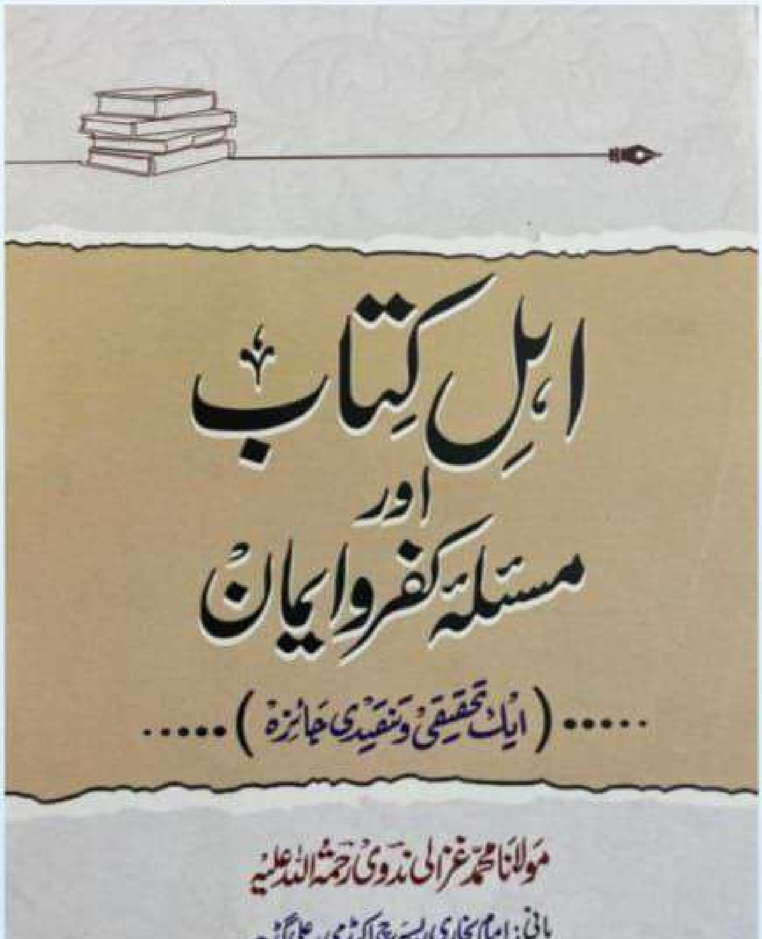

For Contact: 9012621589